احتشام حسین

کی

تخلیقی نگارشات

(ایک مطالعہ)

ڈاکٹر شہزاد انجم

پروفیسر احتشام حسین بھی اب ہمارے ماضی کا ایک حصّہ ہیں۔ اُن کی شخصیت کی تعمیر جن خطوط پر ہوئی ہے وہ ہمیں بنیادی ریاض کے حامل نظر آتے ہیں اور ماضی کے خطوط کی یاد دلاتے ہیں۔ میں ان خطوط کا مطالعہ اس لئے بھی پیش کر رہا ہوں کہ ادب میں بھی اختصاص (Specialization) کی جو عام ہوا چل پڑی ہے اس سے بڑی شخصیتوں کے سامنے آنے میں جو کمی آرہی ہے اس کا احساس دلایا جا سکے۔ احتشام حسین اگر صرف تنقیدی مضامین لکھتے تو ان کی شخصیت اور ان کی تنقید نگاری کو وہ بلندی اور وقار حاصل نہ ہوتا جو آج ہے۔ ان کے تخلیقی ذہن اور تخلیقی عمل کے تجربات نے انہیں دوسرے فن پاروں کی تہہ تک اُترنے میں مدد دی ہے۔ ان کے سفرناموں کے مطالعہ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ فکر و نظر کی تعمیر میں ان کے سفر امریکہ اور یورپ نیز روس نے کس قدر مدد پہنچائی۔ ان کے افسانوں کے ذریعہ ہم ان کی ہمدردیوں اور اُن کے کرب دونوں کا احساس کر سکتے ہیں۔ اُن کی شاعری محسوسات کی دُنیا کو کس طرح سمیٹتی ہے اور ان کے احساسات کی زبان کس طرح ہم سے مخاطب ہوتی ہے۔ پھر وہ جب کسی سے تحریری گفتگو کرتے ہیں یعنی خط لکھتے ہیں تو ان کا سلوک کیا ہوتا ہے اور کس طرح وہ اپنے محسوسات اپنی فکر اور نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں اور کیا مجموعی طور پر یہ سارے جلوے اُن کی شخصیت کو عظیم بنانے میں معاون ہوتے ہیں یا نہیں؟

شہزاد انجم

احتشام حسین کی تخلیقی نگارشات
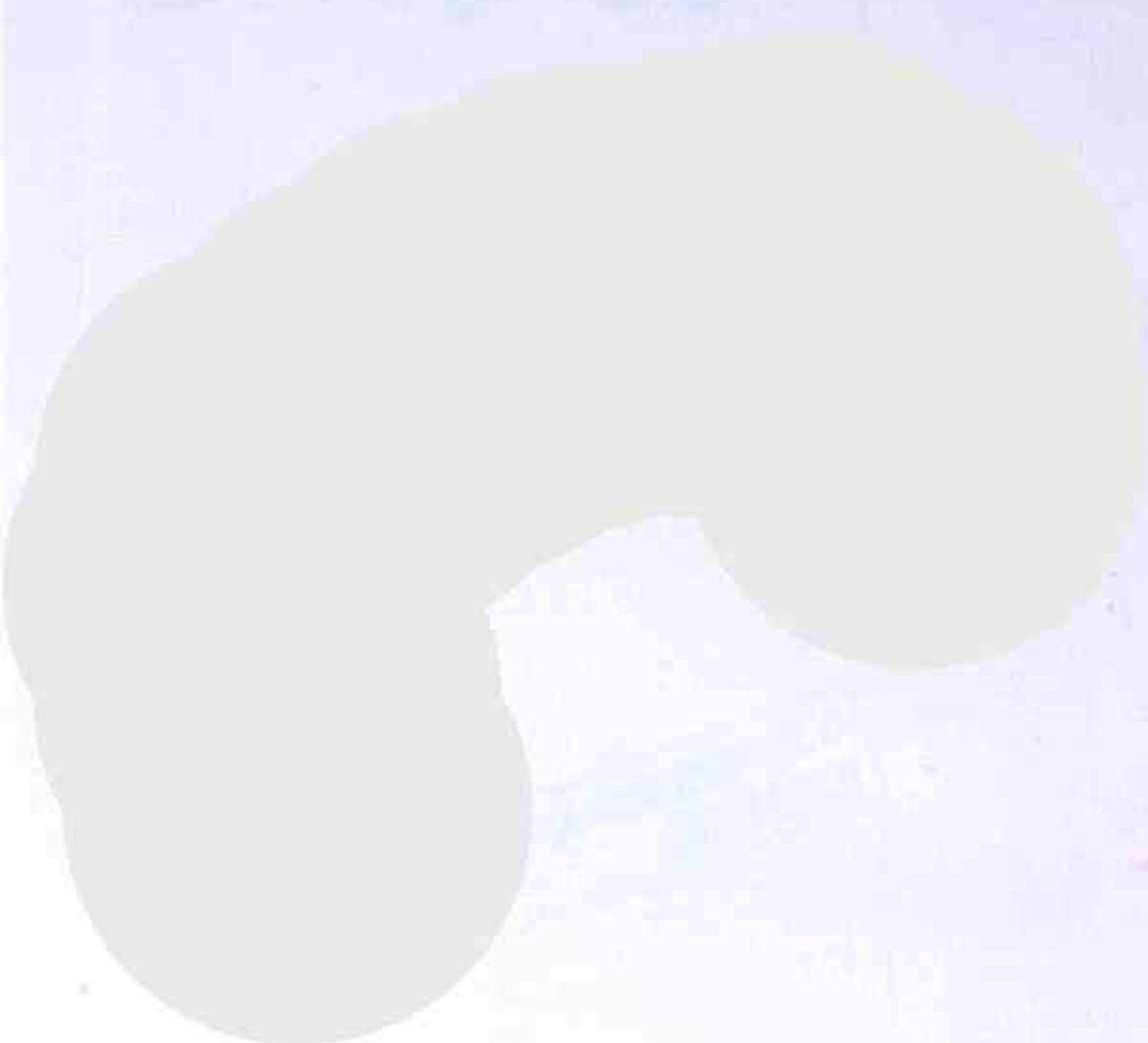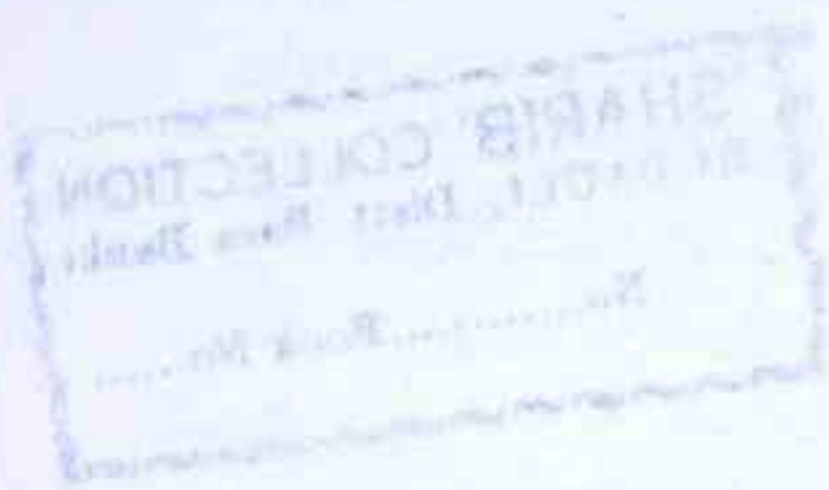
(ایک مطالعہ)

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش، لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

احتشام حسین کی تخلیقی نگارشات

(ایک مطالعہ)

ڈاکٹر شہزاد انجم

شعبۂ اُردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ گرلس کالج
رام پور (اترپردیش)

EHTESHAM HUSAIN KI TAKHLIQI NIGARSHAT

(Ek Mutala)

by :

Dr. SHAHZAD ANJUM

نام مصنف : شہزادانجم

مستقل پتہ : کارڈ سنٹر، بڑی مسجد، معروف گنج، گیا (بہار)۔۸۲۳۰۰۱

موجودہ پتہ : گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ گرلس کالج رامپور (اتر پردیش)۔۲۴۴۹۰۱

ناشر : مصنف

سال اشاعت : مارچ ۲۰۰۰ء

تعداد : چارسو

قیمت : -/150 (ایک سو پچاس روپے)

کمپیوٹر کمپوزنگ : منصور رضا، بڑی مسجد، معروف گنج، گیا

مطبع : راحت آفسیٹ پروسس، دہلی

معیار پبلی کیشنز

کے۔۳۰۲/تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی ۱۱۰۰۳۱

انتساب

(اماّں مرحومہ کے نام)

اماّں!

آپ کی آنکھوں میں جن بہاروں کے خواب تھے،

اُنھیں میں لے آیا ہوں

کاش! آپ کچھ اور انتظار کر لیتیں
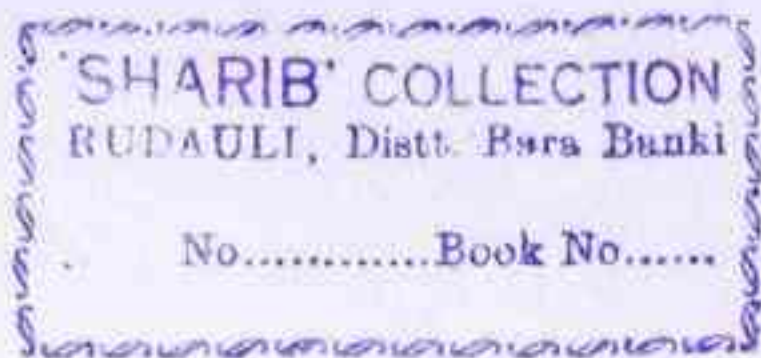
— شہزاد انجم —

ترتیب

نَقشِ اَوّل

" احتشام حسین کی تخلیقی نگارشات "
اُردو کے جواں سال نقّاد اور ادیب جناب شہزاد انجم کی پہلی مستقل تصنیف ہے ۔ اُن کے کئی تنقیدی مضامین مؤقر اور معتبر ادبی جرائد میں شائع ہوکر ارباب نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔انتہائی مسرت کی بات ہے کہ اُنھوں نے بلا تاخیر ایک اچھوتے اور اہم موضوع پر اپنی ایک مبسوط اور جامع کتاب بھی دنیائے ادب کے سامنے پیش کردی۔پروفیسر احتشام حسین کا نام اردو تنقید میں ایک تابناک اور روشن مینارہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی روشنی میں جدید تنقید

نگاری نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ڈاکٹر محمَد حسن کے الفاظ میں جدید اردو تنقید نگاری پر صرف احتشام حسین کی حکمرانی رہی ہے اور مولانا عبد الماجد دریا آبادی کے خیال میں 'دور احتشامی سے پہلے صحیح معنوں میں اردو تنقید تھی ہی نہیں۔احتشام حسین کی تنقید نگاری کے مختلف پہلوؤں پر بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں۔تحقیقی مقالے سپرد قلم کئے گئے ہیں اور کئی مستقل تصنیفات بھی پیش کی گئی ہیں۔لیکن ان کی تخلیقی نگارشات پر کوئی مستقل کتاب تو در کنار مضامین اور مقالات بھی بہت کم تعداد میں ملتے ہیں۔حالانکہ احتشام حسین بلند پایہ تنقیدی شعور کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا تخلیقی جوہر بھی رکھتے تھے۔ویسے ہر اچھّا نقّاد تخلیقی حِسّیت کا حامل ہوتا ہے۔اس اہم نکتہ کی طرف شہزاد انجم نے اپنی اس گرانقدر کتاب کے آغاز میں ہی اشارہ کردیا ہے۔اگر نقّاد کے پاس کسی نہ کسی طرح کا تخلیقی جوہر نہ ہو تو وہ ایک اچھّا نقّاد نہیں بن سکتا۔یہ الگ بات ہے کہ بعض نقّادوں کے یہاں اس تخلیقی جوہر کا اظہار

عملی شکل میں بھی نظر آتا ہے اور بعض کے یہاں
اس کی جھلک صرف تنقیدی مضامین میں ملتی ہے۔

تفصیل میں جانے کا موقع ہو تا تو قدیم
ادبی تذکروں سے بات شروع کی جا سکتی
تھی۔لیکن دورکیوں جائیے شبلیؔ،آزادؔ،
حالیؔ،امداد امام اثرؔ، مجنوں گورکھپوری،نیازؔ فتح
پوری ،آل احمد سرور، کلیمؔ الدین احمد ،خلیلؔ
الرحمنٰ اعظمی ،محمد حسنؔ ،وزیر آغا اور شمس
الرحمنٰ فاروقی کے نام اس سچائی کے ثبوت میں
پیش کئے جا سکتے ھیں۔ شہزاد انجم نے احتشام
حسین کی تخلیقی نگارشات کو اپنے تنقیدی
تجزئیے کا موضوع بنایا اس سے ان کی وسعت نظر
کا پتہ چلتا ھے۔ کیونکہ احتشام حسین کا تخلیقی
سر مایہ کمیت اور کیفیت دو نوں اعتبار سے اہم
ھے۔ انھوں نے اپنی ادبی تخلیقات محض منہ کا
ذائقہ بدلنے کے لئے پیش نھیں کیا۔ موضوعات کے
تنوّع کے ساتھ ساتھ اصناف کا تنوّع بھی ان کی
تخلیقی نگارشات کی ادبی قدروقیمت متعین کرنے
کا مطالبہ کرتا ھے۔شہزاد انجم کے شائستہ ادبی
ذوق اور فکر ونظر کی داد نہ دینا زیادتی ھوگی کہ

انھوں نے اس انمول خزانے کو کبھی کبھی کی موج نہ سمجھ کر ایک مبسوط تنقیدی جائزے اور مفصلّ انتقادی محاکمہ کی چیز سمجھا۔

اس تحقیقی اور تنقیدی کام کے لئے جس عرق ریزی ،لگن اور دِقّت نظر کی ضرورت تھی اس کا ثبوت ان کے اس مقالہ میں قدم قدم پر ملتا ہے۔انھوں نے سب سے پہلے احتشام صاحب کی شخصیت کا تجزیہ ان کے خاندانی ،تھذیبی ،تعلیمی،سماجی اور فکری پس منظر کی روشنی میں کیا۔فن کار خلامیں پیدا نھیں ھوتا اس کی شخصیت کی تعمیر و ترتیب میں مختلف النوع اثرات کام کرتے ھیں۔اُن کی چھان بین کرنا،شناخت کرنا،گھرائی اور گیرائی کا اندازہ لگانا بڑا پیچیدہ اور دشوار گزار عمل ھوتا ھے۔مجھے یہ کھنے میں ذرا بھی جھجک اور ھچکچا ھٹ محسوس نھیں ھوتی کہ شھزاد انجم اس ذِمّہ دارانہ مرحلہ سے بڑی کامیابی کے ساتھ عھدہ بر آ ھوئے ھیں۔ایک بار فنکار کی شخصیت تنقید نگار کی گرفت میں آجائے تو آگے کی منزلیں آسان ھوتی جاتی ھیں ۔احتشام صاحب کی افسانہ

نگاری ہو ،ان کی غزل گوئی ہو یا نظم نگاری۔سفر کی کہانی ہو یا مکتوب نگاری ہر گوشہ پر انکی نگاہ بھر پور پڑی ہے۔

احتشاؔم حسین کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے مختلف نقّادوں کی آراء پر بھی خاصا سوچ وچار کیاھے اور اپنی انتقادانہ رائے کو تقا بلی مطالعے کے بعد بڑی احتیاط کے ساتھ پیش کیاھے۔انھوں نے ٹھیک ھی کھا ھے کہ ان کی کھانیوں میں غریبی اور بے بسی کی متحرك اور زندہ تصویریں ملتی ھیں ۔سماجی بندشوں کے خلاف احتجاج کی تیز لَے کا احساس ھوتا ھے ۔ان کے یھاں سیاسی اور معاشی مسائلؔ عشق ومحبت اور خیال وعمل سب ایك دوسرے میں پیوست اور گتھے ھوئے ھیں ۔وہ ان کے افسانوی عمل کو تخلیقی تعمیری اور شعوری مانتے ھیں ۔ان کی اس رائے سے اختلاف کرنا بھت مشکل ھے کہ اگر احتشام حسین نے اپنی افسانہ نگاری میں اپنی تخلیقی صلاحیت کا استعمال اپنی اصل ادبی پھچان کے لئے کیا ھوتا تو وہ یقیناً اردو کے اھم افسانہ نگاروں میں شمار کئے

جاتے ۔

جہاں تک احتشام صاحب کی شعری تخلیقات کا تعلق ھے یہ بات کسی قدر یقین سے کھی جا سکتی ھے کہ اُن میں شعرگوئی کا ملکہ فِطری طور پر موجود تھا ۔اُن کی شاعری حِسیّہ تصویروں کی زبان ھے ۔جس میں غمِ ذات بھی جھلکتا ھے اور غمِ کائنات بھی ۔شعر و شاعری کا ورثہ بقول شھزاد انجم اُن کو اپنے گھر اور اپنے ماحول سے ملا تھا ۔اسی لئے یکسوئی کے ساتھ شاعری کی دیوی کی پوجا نہ کرنے کے باوجود اُن کے تخلیقی اِمکانات شعری جمالیات کی دُنیا میں نمایاں طور پر اپنا جلوہ دکھا جاتے ھیں ۔اُن کے شعری محرّکات اور انفرادی شناخت کو پوری طرح اُجاگر کرنے میں شھزاد انجم کی نگاہ سے کوئی گوشہ اوجھل نھیں ھوا ھے ۔میں بار بار کوشش کرکے کسی ایسے شعر یا کسی ایسی نظم کی نشاندھی کرنا چاھتا تھا جواحتشام صاحب کی شعری تخلیقات میں انتھائی اھم ھونے کے باوجود اُن کی نظر میں نہ آسکی ھو اور جس کا انھوں نے حوالہ نہ دیا ھو ۔لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑتا ھے

کہ اس باب میں مجھے مایوسی نہیں ہوئی ۔میرے عِلم میں احتشام حسین کے شاعرانہ کلام کا شاید ہی کوئی ایسا اہم گوشہ ہو جو ان کی توجّہ کا مرکزبننے سے رہ گیا ہو ۔یہ بڑی بات ہے اور جب نقّاد نو عمر ہوتو اس امتیازی وصف کی اہمیت اوربڑھ جاتی ہے ۔مجھے ان کی اس رائے سے پورا اِتّفاق ہے کہ تشبیہات اور استعارات کا برمحل استعمال،قلبی واردات و کیفیات کی متحرك تصویریں،گھری معنویت اور نئے انداز کی پیکرطرازی احتشام حسین کی شعری کائنات کی مخصوص اور مُنفرِد صفات ہیں۔

میری نظر میں اس کتاب کا سب سے اہم باب وہ ہے جس کا تعلّق احتشام حسین کے سفر ناموں سے ہے ۔"ساحل اور سمندر" احتشام حسین کا نہایت اہم اور وقیع تخلیقی کارنامہ ہے ۔اس سفر نامہ کے ساتھ دوسرا مختصر اور نامکمل سفرنامہ جو "سوویت یونین۔ تاثرات اور تجزئیے "کے نام سے ان کے انتقال کے برسوں بعد شائع ہوا۔شہزاد انجم کے تحلیل وتجزیئے کا موضوع بنا۔ انجم نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے

ساتھ سفر نامہ کی ابتداء اور روایت، ھئیت اور ساخت سے بحث کرتے ھوئے اردو زبان و ادب میں سفر ناموں کے بیش قیمت ذخیرے کو کھنگال ڈالا ھے۔سفر نامہ پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے انھوں نے اتنا مواد فراھم کردیا ھے کہ وہ بجا طور پر کھہ سکتے ھیں کہ ؎

دُعائیں دیں مِرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نِکل آئے مِرے ہمراہ منزل سے

(ثاقبؔ لکھنوی)

مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نھیں کہ کئی سفر ناموں کا علم مجھے اس باب کے مطالعے کے بعد ھوا۔مختلف سفرناموں کا جائزہ لینے کے بعد انجم نے "ساحل اور سمندر" کی ادبی اور فنّی قدر وقیمت کا تعین جس تنقیدی سوجھ بوجھ کے ساتھ کیا ھے اس کے لئے ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ھے ۔اس سفر نامہ میں احتشام صاحب کے نثری رنگ و آھنگ کی جو الگ شناخت

انھوں نے کرائی ھے اُس کی طرف ابھی تک کم لوگوں کا دھیان گیا تھا۔اس خوبی کو اس تجزیاتی انداز میں اجاگر کر کے انجم نے ایک گراں قدر خدمت انجام دی ھے۔

مکتوب نگاری کے باب میں اُردو زبان میں خاصا کام ھواھے۔اس پورے سرمائے پر شھزاد انجم کی نگاہ کا اندازہ ھوتا ھے ۔جب سے غالبؔ نے مراسلہ کو مکالمہ بنادیا۔اُسی وقت سے مکتوبات کو اردو زبان میں ایک مخصوص اھمیت حاصل ھوگئی ۔خطوط نگاری کی فنّی ماھئیت اور نوعیت اور اس کی سماجی اور فنّی اھمیت سے مفصّل بحث کرنے کے بعد ایک مکتوب نگار کی حیثیت سے احتشام صاحب کے متعلق انھوں نے جو نتائج نکالے ھیں وہ قابل غور ھیں ۔ انھوں نے ٹھیک ھی کھا ھے کہ احتشام حسین کے خطوط میں ذاتی زندگی کے نشیب وفراز کے ساتھ ان کے عھد کی ادبی اور علمی، سیاسی اور تھذیبی رجحانات اور تحریکات کی جھلکیاں بھی ملتی ھیں جو ان کی ادبی اور تاریخی اھمیت میں اضافہ کرتی ھیں۔ان کے خطوط کا اسلوب سادہ سلیس اور دو ٹوک

ھے۔نقد ونظر کی گھرائی اور چھان بین کے علاوہ اس کتاب کا ایك نمایاں اور درخشندہ پھلو مصنف کا اسلوب اظھار ھے۔ انجم کی نثر آئینہ کی طرح صاف اور واضح ھے۔جس میں ادبی آب ورنگ کی جھلك نظر آتی ھے۔وہ صاف بات کھتے ھیں لیکن اسے کھنے کا سلیقہ اور ھنر بھی انھیں آتا ھے۔یہ نقش اوّل ھے،نقوشِ ثانی یقیناً اس پر اضافہ کی حیثیت رکھیں گے ۔مجھے ان سے بڑی توقعات وابستہ ھیں۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

ڈاکٹر مُحَمَد مُثَنیٰ رضوی

اِبتِدائِیہ

شہر گیا بلند قامت بودھ مندر' وشنوپد' رام ساگر اور بیتھو شریف کی خانقاہوں، مختلف نوابوں، گیوال رئیسوں، سیاسی، مذہبی، ثقافتی مظاہروں کے لئے وسطی بہار کا ایک مشہور مقام ضرور ہے لیکن اس کے علاوہ اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہاں دو اہم مراکز بھی رہے ہیں۔ ایک تو مگدھ یونیورسٹی کا شعبۂ اُردو' دوسرا کلام حیدری مرحوم کی کلچرل اکیڈمی۔ اُردو کے صفِ اوّل کے نقادوں' شاعروں اور ادیبوں میں کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے گیا کو رونق

نہ بخشی ہو۔ایسے ہی ایک بلند قامت عالم، نقاد، شاعر اور ادیب پروفیسر احتشام حسین بھی تھے جو وقفہ وقفہ سے گیا تشریف لاتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد کلچرل اکیڈمی کے مشہور ماہنامہ "آہنگ" نے ان کی یاد میں ایک تاریخی نمبر بھی شایع کیا تھا جو اردو کے ادبی سرمایہ میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

احتشام صاحب گیا کے علمی وادبی حلقہ میں آج بھی بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ یاد کئے جاتے ہیں۔میں نے اپنے بڑوں سے ان کا ذکر بار بار سنا' اپنے اساتذہ کو ان کا بے حد معترف پایا اور پھر جب احتشام صاحب کی شخصیت کا مطالعہ کیا تو ان کی عظمت کے نقوش میرے دل پر اور گہرے ہوتے چلے گئے اور یہ خواہش دھیرے دھیرے عزم میں تبدیل ہوتی گئی کہ میں بھی احتشام صاحب پر کچھ کام کروں۔ میرے لئے یہ مسرّت کا مقام ہے کہ میں یہ کتاب احتشام صاحب کے تخلیقی ادب پر پیش کر کے اپنی دیرینہ آرزو کی ایک حد تک تکمیل کر رہا ہوں۔

سیّد احتشام حسین کی تنقید نگاری نے اردو ادب میں اتنی اہم، وقیع اور گرانقدر حیثیت حاصل کر لی ہے کہ ان کے تخلیقی ادب پر اس قدر توجہ کے ساتھ غور وخوض نہیں کیا گیا جس کا یہ مستحق ہے۔ان کی شاعرانہ حیثیت،ان کے افسانوں کی قدر و قیمت اور ان کے سفر ناموں کی انفرادیت پر ابھی بھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔احتشام حسین کے مکتوبات' ان کا ڈرامہ اور ان کے تراجم بھی بلاشبہ اہمیت کے حامل ہیں۔وہ بیک وقت مدبّر، مفکّر، مقرّر، عالم اور ایک تنقیدی و تخلیقی ذہن کے

مالک تھے۔ انہوں نے اردو تنقید میں جو گرانقدر اضافہ کیا ہے اور اپنے قلم کی جولانی اور فکر کی گہرائی و گیرائی سے ناہموار اور بنجر زمینوں پر بھی جس قدر شادابی بکھیری ہے اس سے اردو کے کسی بھی طالب علم کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ان کی تنقید نے تو ہمالیائی بلندیوں کو چھولیا ہے اس کے مقابلہ میں ان کا تخلیقی ادب کوہسار کے دامن میں چھوٹے چھوٹے آبشاروں اور دلکش پھولوں کی مانند ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی دیگر ادبی کاوشوں پر مناسب توجہ نہیں دی جاسکی۔

احتشام حسین ساداتِ رضویہ کے ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ غور و فکر کا عمل ابتدائے شعور سے ہی جاری تھا۔ وہ انتہائی خلوص کے ساتھ اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "ویرانے" ۱۹۴۴ء میں، سفر نامہ یورپ اور امریکہ "ساحل اور سمندر" ۱۹۵۵ء میں، ان کا شعری مجموعہ "روشنی کے دریچے" (بعد از مرگ) ۱۹۷۳ء میں منظر عام پر آیا۔ انہوں نے روس کے سفر پر کچھ نوٹس لکھے تھے جسے بعد میں ڈاکٹر اجمل اجملی نے "سوویت یونین...... تاثرات اور تجزیئے" کے نام سے ۱۹۸۴ء میں شائع کیا۔ ان کا ایک ڈرامہ بعنوان "اندھیری راتیں" بھی اوائل دور میں شائع ہوا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی تمام تر تخلیقات کو اعلیٰ درجہ کے ادب میں شامل نہیں کیا جاسکتا مگر ان کے مطالعہ سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ احتشام صاحب کا دل تخلیق کے لئے اکثر بے چین رہتا تھا اور جب وہ کسی تخلیق کو پیش کرتے تو اس کے اندر جمالیاتی حظ کے ساتھ ساتھ غور و فکر کا خاصا سامان موجود

ہو تا۔ احتشام حسین کے افسانوں میں سماجی شعور، عصری آگہی، ذہنی کشمکش، فکر کی بالیدگی اور روشن خیالی کے واضح نقوش پائے جاتے ہیں ۔ان کی غزلوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری کا دائرہ اگرچہ محدود ہے مگر ان کے تجربوں میں خلوص اور صداقت کی جھلک ہے۔ ان کا لب ولہجہ مترنّم ہے جس میں گھلاوٹ اور نرمی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ زبان وبیان کے اعتبار سے کلاسیکی ربط وضبط اور رچاؤ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں نئے طرز کی پیکر سازی کا عمل اور اس عہد کا شعور ملتا ہے۔ ان کے سفر نامہ میں مشاہدے کی گہرائی' باریک بینی اور وسیع النظری کے ساتھ اچھی، سلیس اور شگفتہ نثر بھی ملتی ہے۔ تخلیقی نثر میں احتشام حسین اسلوب کی تروتازگی اور نثری آہنگ پر گرفت رکھنا جانتے تھے اسی لئے قاری "ساحل اور سمندر" کے مطالعہ کے وقت پوری طرح اس سے اپنے آپ کو جڑا محسوس کرتا ہے۔ احتشام حسین کے خط لکھنے کا انداز بھی والہانہ اور مشفقانہ ہے۔ وہ الفاظ کے بناؤ سنگھار سے دور رہ کر خیالات کی وضاحت اور اس کی ترسیل پر کچھ زیادہ ہی توجہ دیتے تھے۔ اس لئے ان کے خطوط ان کے مافی الضمیر کی بھرپور ادائیگی کرتے نظر آتے ہیں۔

اس کتاب کو پیش کرتے ہوئے میں امید کرتا ہوں کہ ادب کا کوئی طالب علم احتشام حسین کے تخلیقی سفر کا جائزہ لینا چاہے گا تو اس کے لئے یہ کتاب معاون ہوگی۔

ادب کے عام طلباء احتشام حسین کا نام آتے ہی صرف مارکسی تنقید کے اُفق کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کی تخلیقی کاوشوں پر یا تو ان کی نظر ہی نہیں یا وہ ان کی اہمیت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ یہ بے خبری آگے چل کر تشویش ناک صورت اختیار کر سکتی ہے کیونکہ شخصیتوں کا مکمل احاطہ ہی ان کی اصل قدر و قیمت سامنے لاتا ہے۔ غالؔب اگر بڑے شاعر تھے تو انِ کے خطوط نے نثر میں بھی انہیں بلند مقام عطا کیا۔ اس طرح غالب شاعری اور نثر دونوں کے مردِ میداں نکلے لہٰذا احتشام حسین کا خلوص صرف ان کی تنقید میں ہی کیوں تلاش کیا جائے؟ ان سے تخلیق کے مختلف سوتے پھوٹتے ہیں جو ادب کے میدانوں کو قابل قدر حد تک سیراب کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی مجموعی عظمت کی نشاندہی کے لئے ان کے تخلیقی سفر کا بھی ایک مثبت جائزہ ناگزیر تھا، لہٰذا میری یہ کتاب اس سلسلہ میں ایک قابل قدر کاوش سمجھی جائے گی۔

(ش۔ا)

بابِ اوّل

شخصیت

اگر علم ذہانت کو توانائی، قلب و نظر کو وسعت اور قوتِ فیصلہ کو اعتماد بخشتا ہے تو شخصیت کا حُسن انہیں تہذیب سے آراستہ کرتا ہے۔ صرف ماہر علم و ہنر ہونا نہ عظمت کی دلیل ٹھہری ہے اور نہ محض حسنِ شخصیت سے ہوا کا رخ بدلا ہے بلکہ علم کی تابانی اور شخصیت کا حُسن جب یکجا ہوئے ہیں، ایک دوسرے میں پیوست ہو کر جلوہ افروز ہوئے ہیں تو وقت کی تقدیر نئے سرے سے لکھی گئی ہے۔ ایسی ہی ایکتقدیر ۲۱/اپریل ۱۹۱۲ء کو وجود میں آتی ہے جس کا نام سیّد احتشام حسین رکھا جاتا ہے۔

علم کا سمندر جب احتشام حسین کے دماغ کو سیراب کرتا ہے تو اس سے پیدا ہونے والی موجیں احتشام حسین کو کبھی ایک عظیم مفکّر، کبھی ایک بڑے عالم، کبھی شاعر، کبھی افسانہ نگار، کبھی ایک شفیق استاد، کبھی ماہر علم مجلس اور کبھی جدید اردو تنقید کے بانی کے روپ میں پیش کرتی ہیں اور جب ان کی شخصیت کے حُسن کے دروازے وا ہوتے ہیں تو احتشام حسین مجسّم اخلاق، غیر معمولی مخیّر، غریب نواز اور کُنبہ پرور کے روپ میں اُبھرتے ہیں تو کبھی منصف مزاجی کی رشک آلود تصویر، مثالی فہم اور وسیع مطالعہ کے مالک، بے حد اچھا حافظہ رکھنے والے،

سادگی پسند، تعلّی سے عاری ایک ایسی دلفریب، دلکش، دلچسپ اور رشک آمیز شخصیت بن کر اُبھرتے ہیں کہ خود بخود دِل و نظر کے راستے ان کے قدم لینے کے لئے وا ہو جاتے ہیں۔

سیّد احتشام حسین کی ساٹھ سالہ زندگی کے تجربات' مشاہدات' فکری رسائیوں' عالمانہ نگاہ اور ذہنی پرواز کے نتیجہ میں مضامین کے آٹھ مجموعے شائع ہوئے' مزید بر آں جوشؔ ملیح آبادی پر ایک جامع مقدمہ کے ساتھ ان کا انتخاب کلام ''انتخاب جوشؔ'' افسانوں کا ایک مجموعہ، ایک مکمل اور ایک نامکمل سفر نامہ، بچّوں کے لئے اُردو کی کہانی اور زبان ہندی میں اُردو ساہتیہ کا اتہاس نیز بیمز کی تصنیف ''این آوٹ لائن آف انڈین فِلالوجی'' کا اُردو ترجمہ ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' کی اشاعت ہوئی۔ پھر ان کی تالیفات ہیں۔ ''آب حیات'' کی تلخیص اور ''تنقیدی نظریات'' (جلد اوّل و دوم) اور کئی کتابوں کے ترجمے ہیں۔ ۱۔ ''کالکی'' از ڈاکٹر رادھا کرشنن ۲۔ ''سوامی وویکانند'' از روماں رولاں ۳۔ ''گنجی کی کہانی'' از لیڈی موراساکی ۴۔ ''سلومی'' از آسکر وائلڈ ۵۔ ''ہماری سڑک'' (جرمن ناول) از جے پٹرسن۔ ان کتابوں کے علاوہ کتنے ہی مضامین، تاثرات، مقدمے، دیباچے یا پیش لفظ (جن کی تعداد کم و بیش تین سو ہے)[1] لکھ کر انہوں نے دور تک علم و ادب کی شمعیں روشن کی ہیں۔ یہ تاثرات، دیباچے' مقدمے' مقالے اور پیش لفظ مختلف رسائل اور مجموعوں میں بکھرے ہوئے شعر و ادب کی تفسیر بیان کر رہے ہیں۔ ان کی تحریروں کا جیسے

---

[1] نگارشات احتشام۔ عبد القوی دسنوی، ماہنامہ آہنگ گیا ''احتشام حسین نمبر'' ۱۹۷۳ء

جیسے تجزیہ ہوتا جارہا ہے، احتشام حسین کا قد مزید بلند ہوتا جارہا ہے' اُن کی عظمت اور بڑھتی جارہی ہے۔

احتشام حسین اسکول کے زمانہ ہی سے اُردو ادب کی خدمت میں لگ گئے تھے۔ فطری ذہانت اور ذکاوت سے لیس، بُردبار' باشعور احتشام حسین نے جنہوں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا کہ آبگینیوں کو کہیں ٹھیس نہ لگ جائے، ہم عصروں کی تخلیقات کے اچھے پہلوؤں کی دل کھول کر داد دی اور کمزور پہلوؤں پر ہمدردانہ نگاہ ڈالی۔ اُن سے اُن کے عزیز واقارب، احباب، شاگردوں اور شناساؤں نے نہ صرف انتہائی پیار کیا بلکہ عالمِ اُردو نیز دیگر زبانوں کے عصری ادیبوں اور شاعروں نے بھی ان سے ٹوٹ کر محبت کی۔ کسی ادیب' شاعر اور نقّاد کو بیک وقت اس قدر شہرت' مقبولیت اور محبت ملی ہو اس کی نظیر شاذ ونادر ہی ملے گی۔

اُن کی پیدائش ساداتِ رضویہ کے ایک زمیندار خاندان میں ۲۱, اپریل ۱۹۱۲ء کو قصبہ ماہُل سے پچھّم کوئی بارہ میل کی دوری پر اتر ڈیہہ ضلع جون پور میں ہوئی۔ نام احتشام حسین رکھا گیا۔ گھر میں عرف عام میں اُنہیں رجّن کہتے تھے۔ وطن بڑی چھاؤنی ضلع اعظم گڑھ یوپی ہے۔ دادا کا نام سید اصغر حسین، والد کا نام سیّد ابو جعفر رضوی اور چچا کا نام حکیم سید ابو محمد تھا۔ سلسلہ نسب امام علی رضاؑ سے ملتا ہے اور خاندان امامیہ اثنا عشری تھا۔ روایت پرست، قدامت پرست اور خاندانی وجاہت پر فخر کرنے والا تھا۔ اپنی خاندانی وجاہت کے متعلق احتشام حسین نے لکھا ہے:-

Who Took Pride In Purity Of

Blood ,Upkeep Of Traditions

And The Distinctions Achieved

By The Ancestors,More Than

In Educational And Material

Achievements. [1]

(جو نجیب الطّرفین ہونے پر فخر کرتا تھا ' روایتوں کو مقدّم اور خاندانی جاہ و حشمت کو علمی اور مادّی حصولیابی سے بہتر سمجھتا تھا)

اُن کا خاندان ادب پرور نہیں تھا۔ والد زمین داری اور مقدمہ بازی میں اپنا زیادہ وقت گذارتے رہے۔ ماہل ایک چھوٹا سا قصبہ تھا مگر وہاں اردو رسائل واخبارات آجاتے تھے۔ یہاں محرّم کے دنوں میں مجلسیں ہوتیں، مراثی پڑھے جاتے اور تقاریر کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ کبھی کبھی مشاعرے بھی ہوتے جس میں قرب وجوار کے علاوہ بنارس، جون پور، فیض آباد اور اعظم گڑھ کے شعراء شریک ہوتے۔ آپ کے بڑے چچا حکیم سیّد ابو محمد بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ اس چھوٹے سے دیہات میں بھی احتشام صاحب کو ایک حد تک ادبی ماحول میسّر آگیا جس نے ان کے ذوقِ ادب وشعر کی پرورش کی۔ ان کی ابتدائی تعلیم کی خشتِ اوّل ان کے پھوپھا سید محمد قاسم صاحب مرحوم اور ان کی پھوپھی کے زیرِ نگرانی ضلع گورکھپور میں رکھی گئی۔

---

[1] سوانحی خاکہ برائے راک فیلر فاؤنڈیشن، ساحل اور سمندر۔ احتشام حسین

والد کے اچانک انتقال کے بعد احتشام حسین کے سر گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا۔ ان سخت حالات میں بھی وہ اپنی محنت، لگن اور ذہانت کی وجہ سے نمایاں کامیابی حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۲۶ء میں مڈل اسکول ماہل سے ورنا کلر پاس کیا۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے ویلزلی ہائی اسکول اعظم گڑھ سے ہائی اسکول کا امتحان ریاضی جیسے دقیق اور خشک مضمون میں اوّل درجے میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ جولائی ۱۹۳۰ء میں انہوں نے گورنمنٹ کالج اِلہ آباد میں انٹر میڈیٹ میں داخلہ لیا۔ ان کے پھوپھا کوتوالی میں سب انسپکٹر تھے۔ احتشام صاحب ان ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ پھوپھا کے پنشن لے کر اپنے آبائی وطن چلے جانے کی وجہ سے احتشام حسین ایک بار پھر بے سر و سامانی میں مبتلا ہو گئے۔ وہ عہد سیاسی تحریکوں اور سر گرمیوں کا عہد تھا اور الہ آباد بھی اس کا مرکز تھا۔ احتشام حسین بتدریج اس سے دلچسپی لینے لگے۔ ان کا سب سے پہلا مضمون اخبار سر فراز لکھنؤ میں ستمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا جس کا عنوان "وزیر اعظم کا مایوس کن فیصلۂ ثالثی"[۱] تھا۔

احتشام حسین نے جولائی ۱۹۳۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں بی۔ اے میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۴ء میں اس امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ احتشام حسین نے پروفیسر دیب کے مشورے سے ایم۔ اے انگریزی میں داخلہ لیا لیکن ایک ہی مہینہ بعد وہ ایم۔ اے اُردو میں داخل ہو گئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مضمون کی تبدیلی اس وقت کے صدر شعبۂ اُردو پروفیسر ضامن علی کے مشورے سے ہوئی

۱۔ خط بنام اکبر رحمانی جلگانوی مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۶۸ء

لیکن ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا کہنا ہے کہ اُن کے ایما پر اُنہوں نے اردو میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۶ء میں احتشام حسین نے الہ آباد یونیورسٹی سے اُردو کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں سب سے زیادہ نمبروں سے کامیابی حاصل کرنے پر اُنہیں دو گولڈ میڈل ملے۔ ''اقبال گولڈ میڈل'' اور دوسرا ''چنتا منی گولڈ میڈل''۔ پہلا اُردو میں فرسٹ آنے پر اور دوسرا ساری یونیورسٹی میں اوّل آنے پر۔

احتشام صاحب کی شادی ۱۹۳۹ء میں سید حسن عسکری صاحب رئیس قصبہ نگرام ضلع لکھنو کی چھوٹی صاحبزادی ہاشمی بیگم کے ساتھ ہوئی۔ ان کی ازدواجی زندگی ہمیشہ خوشگوار اور ہم آہنگ گذری۔ ان کی رفیقہ حیات ان کی مزاج داں تھیں احتشام صاحب بھی اپنی ہاشمی بیگم کا بے حد خیال کرتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے جذبات و محسوسات کا احترام کرتے۔ احتشام صاحب کتب بینی اور تصنیف و تالیف میں زیادہ وقت گذارتے۔ ان کا پورا گھر لائبریری کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ رشتہ دار، ادباء و شعرا کی ہمیشہ آمد رہتی اور تادیر قیام بھی۔ ہاشمی بیگم نے ایسے ماحول میں احتشام صاحب کو خوش رکھنے اور گھریلو فضا کو سازگار و خوشگوار بنانے میں غیر معمولی حصّہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی خوش و خرّم گذری۔

احتشام حسین کو خدا نے چار بیٹے اور دو بیٹیاں عنایت کیں۔

۱۔ سید جعفر عباس ۲۔ سید جعفر عسکری ۳۔ سعیدہ بانو

۴۔ ثریا جبیں ۵۔ سید ارشد حسین ۶۔ سید جعفر اقبال

احتشام حسین کا رنگ گورا' قد پانچ فٹ دس انچ' اونچی پیشانی'

سیاہ بال، نمایاں ناک، سرُخ ہونٹ، چمکدار موتی جیسے دانت اور چہرے پر ہلکے چیچک کے داغ تھے۔ وہ سادہ لباس پہنا کرتے تھے۔ ہر کپڑا اُن کے جسم پر اچھا لگتا تھا۔ ابتدا میں ٹوپی شیروانی اور چوڑی مہری کا پائجامہ پہنتے تھے۔ امریکہ کے سفر کے بعد پینٹ شرٹ بھی پہننے لگے۔ مشہور محقق گیان چند جین نے اختشام حسین کے متعلق اچھّی بات کہی ہے:-

" انگریزی کی کھاوت ھے سادہ رھنا اور اونچا سونچنا اور وہ اس کا جیتا جاگتا نمونہ تھے،ان کے لباس اور سامان سفر میں سادگی ھی سادگی ھوتی تھی ۔ان کے کاغذات کا چرمی بیگ بے رنگ اور بوسیدہ تھا ۔وہ کبھی بالوں میں تیل نہ لگاتے تھے ۔ کھتے تھے کہ صحت کے اعتبار سے بالوں میں تیل ڈالنے کا کوئی فائدہ نھیں ھے ھاں،یہ ضرور ھے کہ بشرے سے وحشت کم ھوجاتی ھے۔" [1]

اختشام حسین لباس کے سلسلے میں بے نیاز سے تھے مگر صاف ستُھرے اور سادگی پسند تھے۔ سادہ کھانا پسند کرتے تھے۔ شاید اس کی یہ بھی وجہ رہی کہ وہ پیچش کے مریض تھے۔ خوش ذائقہ اور بد ذائقہ کھانوں کا امتیاز ان کی نظر میں تھا لیکن کبھی بھی وہ بد ذائقہ چیز کھا کر حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔

اختشام صاحب کا تقرّر بحثیت لکچرر لکھنوء یونیورسٹی میں

---

[1] کچھ بھولی بسری یادیں، فروغ اردو لکھنو "اختشام حسین نمبر" صفحہ نمبر ۵۳

۱۹۳۸ء میں ہوا۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کے مطابق:-

"۱۹۳۸ء میں ایم اے کے نصاب میں اردو داخل ہوئی اور اردو کے ایك لکچرر کے تقرر کی ضرورت پیدا ہوئی ۔ لکچرر کی جگہ مشتہر کی گئی درخو استیں آنے لگیں ۔ سلیکشن کمیٹی بن گئی ۔ احتشام حسین نے بھی درخواست دی۔ لکھنئو آکر مجھ سے ملے ۔پھلی ھی ملاقات میں مجھ کو ان کی موجودہ اھلیت اور آئندہ ترقّی کے امکانات کا اندازہ ہو گیا ۔سلیکشن کمیٹی کی میٹنگ ہوئی ۔صدر شعبہ کی حیثیت سے میں نے احتشام صاحب کا نام پیش کیا۔ کمیٹی کے بعض ممبروں نے تائید کی ۔مگر ہم لوگ وائس چانسلر صاحب کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے ۔بھت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد آخر کار میری تجویز کے مطابق ووٹ لئے گئے اور کثرت رائے سے احتشام صاحب کا انتخاب ہو گیا۔تھوڑے دن کے بعد ایکزیکٹیو کانسل نے ان کا تقرر بھی کر دیا۔"[1]

اس وقت لکھنو شعر و ادب، کا نگار خانہ اور علم و ہنر کا گھوارہ تھا۔ نوابین اودھ کی ادب دوستی، فنکار نوازی نیز ماہرینِ فن کی سرپرستی سے کون واقف نہیں۔ لکھنو کو اس کی تہذیبی و تمدنی اور ادبی و ثقافتی

---

[1] فروغ اردو لکھنؤ، "احتشام حسین نمبر" صفحہ ۳۴

روایات کی بنا پر تاریخِ ادب میں اہم مرتبہ حاصل ہے۔ احتشام حسین ۱۹۳۸ء تا اکتوبر ۱۹۶۱ء لکھنؤ یونیورسٹی میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ اس وقت لکھنؤ میں جہاں ایک طرف صفؔی لکھنوی، آرزو لکھنوی، اثر لکھنوی، یگانہ چنگیزی، عبد الماجد دریا آبادی، اختر علی تلہری، شیخ ممتاز حسین جونپوری، مولانا عبد الباری آسی، مرزا محمد عسکری اور پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی جیسے نثار اور شاعر ادب و شعر کی مسند پر جلوہ افروز تھے وہیں دوسری طرف ڈاکٹر عبد العلیم، پروفیسر احمد علی، سجّاد ظہیر، محمود الظفر، علی سردار جعفری، کیفؔی اعظمی، سلام مچھلی شہری، آلِ احمد سرور اور مجازؔ وغیرہ کے جواں حوصلوں نے لکھنؤ میں ادبی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں۔ اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی کے اساتذہ بھی اچھی شہرت کے مالک تھے۔ نفسیات میں کالی پرشاد، تاریخ میں رادھا کمد مکھرجی، اقتصادیات میں رادھا کمل مکھرجی، انتھراپولوجی میں ڈی این مجمدار، انگریزی میں ان۔ کے سدھانت اور احمد علی اُردو فارسی میں مسعود حسن رضوی ادیب، عربی میں ڈاکٹر وحید مرزا اور ڈاکٹر عبد العلیم، سائنس میں ڈاکٹر بربل ساہنی وغیرہ جیسی معروف و مشہور ہستیاں لکھنؤ یونیورسٹی سے وابستہ تھیں اور احتشام حسین اس علمی و ادبی ماحول اور دانشوری کا ایک حصّہ تھے۔

احتشام حسین لکھنؤ کے ادبی ماحول میں اپنے علم کی جوت جگاتے رہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے درو دیوار ان کی دانشوری اور عظمت کے گواہ ہیں۔

نومبر ۱۹۶۱ء میں احتشام حسین صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے الہ آباد یونیورسٹی آگئے۔اس وقت الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر بابو رام سکسینہ تھے اور اساتذہ میں پروفیسر پنت، پروفیسر بی آر شرما، ،ڈاکٹر ان ڈی شکلا، پروفیسر ڈی۔ان سنہا جیسے دانشور موجود تھے۔احتشام حسین کو لکھنؤ سے محبّت تھی مگر جب لکھنؤیونیورسٹی میں پروفیسر شپ کے آثار نظر نہ آئے تو انہیں لکھنؤ کو خیر باد کہہ کر الہ آباد آنا پڑا ۔احتشام صاحب اپنی بُردباری،ذہانت وذکاوت ،اعتدال پسندی،رفاقت کے آداب اور سنجیدگی کی وجہ سے یہاں بھی بہت جلد مقبول ہوگئے۔ وہ الہ آباد یونیورسٹی کے ڈین بھی رہے، مجلس انتظامیہ کے ممبر بھی اور آخردم تک یونیورسٹی کے آنریری لائبریرین بھی رہے۔انہوں نے الہ آباد ٹیچرس ایسو سی ایشن کے صدر کی حیثیت سے کئی نازک مسئلوں کو بخوبی حل کیا۔الہ یونیورسٹی میں اُن کی مقبولیت اور کارکردگی کے متعلق فراق گورکھپوری،جو احتشام حسین کے استاد بھی رہے تھے،یوں رقمطراز ہیں:-

”ہماری یونیورسٹی میں بہت سے شعبے ہیں اور ان میں ہرشعبہ کا استاد احتشام صاحب کو اپنا سمجھتا تھااور دل سے عزیز رکھتا تھا۔ ان کی معلومات ،ان کے مطالعے، ان کی قوّت فکر کی گہرائی نے سب کو مسحور کر رکھا تھا ۔ کتنی ذمّہ داریاں انہوں نے اپنے سر لے رکھی تھیں ۔شعبۂ

اُردو کے صدر تھے، وائس چانسلر کے خاص مشیر کار، نہ جانے کتنی کمیٹیوں کے ممبر تھے۔سب اُن کی رائے جانناچاہتے تھے اور اُن کی بات کو صحیح سمجھتے تھے۔بلکہ ہم لوگوں کو تو احتشام صاحب سے شکایت ہونے لگی تھی کہ وہ صرف کمیٹی کے ہو کر رہ گئے ہیں ہم لوگوں کے لئے ان کے پاس وقت ہی نہیں رہ پاتا لیکن جب وہ ملتے تو اتنی محبّت سے ملتے کہ سب گلے دور ہوجاتے۔" [1]

احتشام حسین ۵۳۔۱۹۵۲ء میں راک فیلر فاوٴنڈیشن کے نمائندے گل پٹرک کی دعوت پر امریکہ گئے۔اس کے ساتھ یورپ کے کئی دوسرے شہروں کی بھی انہوں نے سیاحت کی۔وہاں کے دانشوروں سے تبادلۂ خیال کیا اور مختلف یونیورسیٹی میں لکچر دیا۔ احتشام حسین نے وہاں کی علمی فضااور ادب کے مختلف پہلووٴں پر وہاں کے ادیبوں اور دانشوروں کے افکار کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا اور بڑے محتاط انداز میں اپنے تاثرات پیش کئے۔۱۹۶۹ء میں غالب صد سالہ تقریبات میں شرکت کی غرض سے انھوں نے سوویت روس کا بھی سفر کیا۔سوویت روس سے ان کی گہری نظریاتی وابستگی تھی۔وہ وہاں کے اہم مقامات، مجسّمے، نقاشی کے نمونے اور نوادرات کو

---

[1] "شاہ کار" "احتشام حسین نمبر" نومبر، دسمبر ۱۹۷۳ء

دیکھتے ہیں اور عش عش کر اُٹھتے ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک سے شروع سے ہی وابستہ رہے تھے جب ۱۹۴۸ء میں یہ جلسے آل احمد سرور کے مکان پر پابندی سے ہوتے تو احتشام حسین اُن میں نمایاں کردار ادا کرتے۔ اُن جلسوں میں شعر وشاعری اور افسانہ و تنقید، ترقی پسند ادب جیسے موضوعات اور مختلف نکات پر بحثیں ہوتیں اور باقر مہدی، کمال احمد صدیقی، احمد جمال پاشا، منظر سلیم، وامق جونپوری، راہی معصوم رضا وغیرہ اُن جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے، تبادلۂ خیال کرتے، اختلاف واتفاق کرتے اور گرما گرم بحث میں حصہ لیتے۔ جب جب ترقی پسند تحریک پر حملے ہوئے، عمیق حنفی، اختر علی تلہری، شمس الرحمن فاروقی وغیرہ قابل ذکر فنکاروں نے کھل کر حملے کئے تو احتشام حسین نے اُن سبھی مخالف ذہن رکھنے والوں کو بڑے سلیقہ اور تفصیل کے ساتھ جواب دیا۔ جدیدیت اور ترقی پسندی کی صف آرائی کی تاریخ میں احتشام حسین اور عمیق حنفی کے مباحثے کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جس کی ایک خاص اہمیت اس لئے بھی ہے کہ احتشام حسین نے نا ملائم الفاظ اور تیور کے ساتھ حملہ کرنے والوں کو بھی بے حد اعتدال کے ساتھ مدلّل جواب دیا اور بحث کا خاتمہ کیا۔ احتشام حسین آخر وقت تک ترقی پسند تحریک کے قد آور وکیل بنے رہے۔

احتشام حسین ادب کے مطالعے کو سیاسی وسماجی مطالبات کی روشنی میں زیادہ معنی خیز سمجھتے تھے۔ اسی لئے جب الہ آباد میں دسمبر ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی تو احتشام حسین اس میں

شامل ہوگئے۔انہوں نے اشتراکی نظریات وافکار کا شعوری طور پر مطالعہ کرنے کے بعد ادب وشعر کا محاکمہ اور تجزیاتی مطالعہ اُن نظریات کی روشنی میں کرنا شروع کیا۔ابتدا میں احتشام حسین نیاز فتحپوری کے اسلوب سے متاثر تھے۔نیاز کی جادو بیانی اور سحر کارانہ نثر کی نقل انہوں نے اپنے افسانوں میں بھی کی لیکن جب وہ عملی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے تو بقول اُن کے وہ "اندھیرے سے روشنی کی طرف آ گئے۔" اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں:

"یہاں اتنی بات عرض کردوں کہ ٹھیک اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تھی اور میں اس کا ممبر بن گیا ۔افکار وخیالات میں زبردست انقلاب آرہا تھا ۔مطالعہ کے موضوعات بدل گئے تھے ۔ادبی اقدار کا تصوّر بدل گیا تھا اور کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندھیرے سے روشنی کی طرف آگیا۔خود نیاز صاحب کی تحریروں پر تنقیدی نگاہ پڑنے لگی تھی۔" [1]

احتشام حسین ترقی پسند تحریک اور ادب کے بے لوث خادم تھے۔ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی والہانہ تھی۔وہ ستائش کی تمنّا اور صلہ کی پروا کئے بغیر آخر دم تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے بقول سجادؔ ظہیر:۔

---

[1] اعتبار نظر۔احتشام حُسین

"انھوں نے اپنی گراں بھا تحریروں سے اس تحریك میں معنویت ،گھرائی ،ھمه گیری اور وسعت پیدا کی اور یه احتشام حسین جیسے شخص کے انتھك کاموں کے سبب سے تھا که وھی مختلف موقعوں پر یه کھه سکتا تھا که اگر کسی وقت یا کسی زمانه میں ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کمزور بھی ھو گئی یا بعض سابق ترقی پسند اس سے منحرف ھوکر موقع پرستی یا رجعت کی سیاہ صفوں سے مل گئے پھر بھی ترقی پسند ادب کی تحریك مسلسل جاری اور باقی رھی۔" [1]

احتشام حسین کا حلقۂ احباب بے حد وسیع تھا۔ وہ اپنی خوش اخلاقی اور آبگینوں کو ٹھیس نہ پہنچانے والے انداز کی وجہ سے خاصے مقبول تھے۔ قیام لکھنؤ کے زمانے میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور آل احمد سرور سے احتشام صاحب کی بڑی قربت رہی۔ علی جواد زیدی سے اگرچہ ذاتی میلانات اور محسوسات میں اختلاف تھا پھر بھی احتشام صاحب کے عالمانہ وقار، نیک سیرتی اور انکساری کی وجہ سے علی جواد زیدی بھی اُن سے بہت قریب رہے۔ اختر اورنیوی ہوں یا جوش ملیح آبادی' ظ۔ انصاری ہوں یا گیان چند جین، احسن فاروقی ہوں یا شمس الرحمن

[1] ترقی پسند تحریک کا معمار (مضمون) "شاہ کار" وارانسی احتشام حسین نمبر

فاروقی سب احتشام صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ اپنے بارے میں خود فرماتے ہیں:۔

''مجھے آبگینوں کو ٹھیس لگانے میں لطف نہیں آتا ۔جہاں تک ہو سکتا ہے اس سے بچتا ہوں ۔میں نہیں چاہتاہوں کہ میری وجہ سے کسی کا دل دکھے،کوشش کرتا ہوں کہ ہمعصروں کی تخلیقات کے زیادہ سے زیادہ اچھے پہلوؤں کا ذکر کروں۔انہیں ڈھونڈڈھونڈ کر نکالتا ہوں اور کمزوریوں پر ہمدردانہ نگاہ ڈالتا ہوں۔اگر مجھے مجبوراً ایسی باتوں کا ذکر کرنا ہی پڑتا ہے جو مجھے درست معلوم نہیں ہوتیں تو ان کا اظہار بھی دل آزاری کے انداز میں نہیں کرتا ۔اب اسے کیا کروں کہ ایک کی تعریف دوسرے کو ناگوار ہوتی ہے۔ ویسے انسان ہوں ممکن ہے کبھی کبھی طنز کے پیرایہ میں کوئی سخت بات قلم سے نکل گئی ہو،احتیاط ضرور کرتا ہوں ۔''[1]

احتشام حسین بلاشبہ ایک قابل رشک شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی فکر ،اُن کے شعور ان کے علم کا مداح ایک زمانہ تھا۔ نظریاتی طور پر اختلاف بھی تھا، مگر احتشام صاحب کی دانشوری'

---

[1] اعتبار نظر۔احتشام حسین

فہم و فراست اور ذکاوت سے کسی کو انکار نہیں تھا۔ مشہور نقاد شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

"احتشام صاحب کا بدل نہ پیدا ہو گا یہ ایک عامیانہ سی بات ہے ۔وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جن کے ساتھ بدل کا تصوّر بھی وابستہ نہیں ہو سکتا ۔یوں تو ہر آدمی اپنی مخصوص انفرادیت رکھتا ہے لیکن بعض لوگوں کی انفرادیتیں کُچھ ایسی ہوتی ہیں جو ان پر ختم ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے احتشام صاحب کی الگ الگ نظیر مل سکے لیکن مجموعی شخصیت میں دوئی کی بُو بھی نہیں۔" [1]

احتشام حُسین کے اعلیٰ کردار ، ان کی شرافت اور سادگی کے سلسلے میں یوں تو ایک زمانہ رطب اللسان ہے پھر بھی مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے خیالات ملاحظہ ہوں:-

" ایسی بزرگ داشت،ایسا انکسار ،ایسی لطافت طبع ،ایسی سلامت روی ،ایسی خوشگوار رواداری بلکہ میں کہوں گا کہ ایسی بے نفسی اور مشرقی اخلاق کی جامعیت کہیں کم ہی دیکھنے میں آئی ہے ......

اس اعلیٰ کرداری اور بے نفسی کے نمونے اگر عام ہو

---

[1] جبیں روشن ہے اس ظلمات میں۔ ماہنامہ "شاہکار" وارانسی "احتشام حُسین نمبر"

جائیں تو دنیائے ادب سے رنجش و فساد کے امکانات
هی عنقا هو جائیں ۔"[1]

اساتذہ ہوں یا احباب، شاگرد ہوں یا رشتہ دار احتشام صاحب سبھی سے اسی انکساری، خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ عمیق حنفی اور اختر علی تلہری سے طویل بحثیں رہیں، جوش بھی ہوش کھو بیٹھتے ہیں، وارث علوی اور کلیم الدین احمد سے اعتدال کا دامن چھوٹ جاتا ہے لیکن ہر جگہ وہ اپنی خاموش طبیعت اور سنجیدہ مزاجی کو بروئے کار لاتے ہیں۔ احتشام حسین کی خاموشی اور بے نیازی اُن کے مخالفین اور بدخواہوں کے لئے عذاب بن جاتی تھی۔ شمس الرحمن فاروقی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

"وارث علوی کے مضامین میں ایسے خیالات کا اظهار تها جن سے ترقی پسند تصوّرات اور علی الخصوص احتشام صاحب پر ضرب پڑتی تهی لیکن مجھ سے یا کسی اور سے اظهار ناخوشی تو بڑی بات هے جب بعض لوگوں نے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی بچکانه کوشش میں اُن مضامین کی تسبیب کی توانهوں نے کها کیا حرج هے اگر نئے نئے خیالات سامنے لائیں،یه بهی ایك طرز تحریر هے۔مجھ سے گفتگو کے دوران ان کالهجه نه صلح جوئی کا هوتا هے اور نه مزاحمت کا ۔دوسروں کی باتیں

---

[1] بوئے بوستان مشرق۔ماہنامہ "شاہ کار" وارانسی "احتشام حسین نمبر"

پوری خاطر جمعی سے سنتے اور اپنی باتیں وضاحت اور اطمینان سے کہتے تھے۔[1]

احتشام صاحب کبھی بھی قہقہہ مار کر زور سے نہیں ہنستے تھے۔ ہنس کر کسی کی مذمت کرنا یا مذاق اڑانا ان کا شیوہ نہیں تھا۔ ان کی گفتگو شگفتہ جملوں اور مزاحیہ نکات سے لبریز تو ہوتی مگر وہ کسی بھی حالت میں کسی کی دل آزاری پسند نہیں کرتے تھے۔ احتشام صاحب ہر طرح کی پست سیاست سے دُور اور مطلب پرست احباب سے دامن بچا کر چلتے رہے۔ جفر عسکری لکھتے ہیں:-

"مصلحت کوشی، بدنما سیاست، غیر علمی وادبی ماحول اور محدود زاوئیہ نظر رکھنے والوں سے وہ ہمیشہ اپنا دامن بچاتے رہے اور دُور دُور رہے۔ ایسے عناصر ہمیشہ ان کے لطیف احساسات کو مجروح کرتے"[2]

احتشام حسین کی موت کو ایک عالم کی موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ صرف بلند پایہ ادیب، نقاد، شاعر اور ماہر لسانیات ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے شرافت، وضعداری، عالمانہ وقار، علم اور بُردباری کے پیکر میں ڈھل کر اس شاعرانہ دعویٰ کی گویا تکذیب کر دی۔

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

آل احمد سرور اُن کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں،

"احتشام صاحب بہت اچھے رفیق تھے۔ کسی کے ذاتی

---

[1] جبیں روشن ہے اس ظلمات میں "شاہکار" وارانسی احتشام حسین نمبر صفحہ ۲۱۵

[2] زندہ اور روشناس خلق ماہنامہ "شاہ کار" وارانسی" احتشام حسین نمبر"

معاملہ میں دخل نہیں دیتے تھے۔ کسی سے اختلاف ہوتا تو
اکثر خاموش ہوجاتے، کسی کا کوئی ذاتی مسئلہ ہوتا تو
اس کے حل کرنے میں ہر ممکن کوشش کرتے۔ تعلّی اُن
کو چُھو تک نہیں گئی تھی۔ اپنے سے سینیئر لوگوں سے
ہمیشہ ادب و احترام سے ملتے تھے۔ چھوٹوں سے شفقت سے
پیش آتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ احتشام سے کسی کا
جھگڑا ہوا ہو یا تلخ کلامی کی نوبت آئی ہو......وہ
ہمارے ادب کی بڑی محترم اور محبوب شخصیتوں میں
سے تھے"[1]

احتشام صاحب نے اپنے شاگردوں کو بھی کبھی مایوس نہیں کیا۔ اُن کے لئے وہ وقت نکال ہی لیتے تھے اور ان کے چھوٹے بڑے مسائل حل کرنے میں لگے رہتے۔ وہ خشک اور دقیق مضامین کو بھی سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ اتنا پھیلا کر بیان کرتے کہ اُن کے شاگرد اُن سے پوری طرح مطمئن ہو جاتے۔ ان کا بیان دلنشیں، لہجے میں مٹھاس اور نرمی، گفتگو میں شیریں متانت اور زور پایا جاتا تھا۔ اُن کی آواز آہستہ اور شائستہ تھی۔ جب کسی ادق یا پیچیدہ مسئلے پر اپنی رائے دیتے، بڑی احتیاط اور توازن سے کام لیتے۔ شعر کا مفہوم بتاتے وقت وہ اس کی اس طرح تشریح کرتے کہ اس کی تصویر ذہنوں پر نقش ہو جاتی۔ احتشام صاحب ہر طرح کی تفریق سے پاک تھے۔ جب وہ کلاس میں لکچر دیتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ علم کا دریا بہہ رہا ہے اور طلباء اپنی پیاس

[1] کچھ یادیں کچھ تصویریں ماہنامہ "شاہ کار" وارانسی "احتشام حسین نمبر"

بجھارہے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین ہی کی زیر نگرانی ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر شارب رُدولوی، ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر شمیم نکہت، ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی وغیرہ نے پی ایچ ڈی کا کام مکمل کر کے ڈگریاں حاصل کیں۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل اپنے مقالہ "احتشام صاحب" میں لکھتے ہیں:-

"اعجاز صاحب کے بنگلے پر احتشام صاحب کے دوستوں اور ملاقاتیوں کا ایک ھجوم اکٹھا ہو جاتاتھا۔ کسی سے ریسرچ کا موضوع پوچھ رہے ھیں، کسی کو متعلقہ موضوع پر کتابیں بتا رہے ھیں، کسی سے امریکہ اور یورپ میں ادیبوں کی حالت پر باتیں کر رہے ھیں، کسی سے اس کے کاروبار اور ملازمت کے بارے میں پوچھ رہے ھیں۔ غرض کہ ان کی مصروفیت اور دلچسپی کی انتھا نہ تھی۔ نہ صرف ھندوستان بلکہ پاکستان کے بھی چھوٹے اور نئے لکھنے والوں سے وہ بخوبی واقف تھے۔" [1]

احتشام صاحب نئے لکھنے والوں کی تحریروں کو بھی غور سے پڑھتے اور کہیں کوئی بات کھٹکتی تو خط کے ذریعہ اس کی وضاحت چاہتے تھے۔ نئے لکھنے والوں کے سلسلہ میں ان کے مُشفقانہ رویہ کے بارے میں مظہر امام کا خیال ملاحظہ ہو:-

---

[1] ماہنامہ "آہنگ" گیا "احتشام حُسین نمبر" ۱۹۷۳ صفحہ ۱۷۸

"نئے سے نئے غیر معروف لکھنے والوں کی تحریروں پر بھی نگاہ رکھنا ،ان کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنا ،اُن کے عروج وزوال سے واقف ہونا،انھیں مشورے دینا، ان کا حوصلہ بڑھانا ---یہ خصوصیات میں نے ان کی نسل کے ادیبوں میں صرف احتشام حسین میں پائیں۔" [1]

احتشام صاحب کا قلم اردو شعر وادب کے حصار میں مقید نہیں تھا دیگر موضوعات پر بھی اُنھوں نے بڑے پُر مغز مضامین لکھے ہیں۔ مثلاً تہذیبی اختلاط، جدید روسی ادب ، نظریاتی ارتقا، یورپی مصوّری، تلسی داس، بھوپال۔۔ایک تاثر، لکھنؤ ـــــ اردو ادب کا علمی اور ادبی مرکز، مسلمان اور ہندی، صحتِ زبان کا مسئلہ وغیرہ۔

احتشام صاحب ایک بلند پایہ مقرر بھی تھے۔ اُن کی تقریر کا ایک خاص لب ولہجہ تھا۔ موضوع کا آغاز دلکش انداز میں کرتے اور بڑے مربوط انداز میں اختتام تک پہنچتے۔ ان کی تقریر کو ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ کر کے ضبطِ تحریر میں لایا جاتا تو ایک مربوط اور منظّم مقالہ کی شکل سامنے آتی۔ کہیں کوئی جملہ زائد معلوم نہیں ہوتا۔ ہر لفظ اپنی جگہ موتی کی طرح روشن رہتا۔

احتشام صاحب نے اپنا نقطۂ نظر ہمیشہ واضح تر رکھا۔ ان کے یہاں کسی مسئلے میں کبھی کوئی اُلجھاؤ یا پیچیدگی نہیں ملتی۔ اُردو۔ ہندی

---

[1] احتشام حسین کا رویہ جدید نسل کے ساتھ "ماہنامہ آہنگ گیا" "احتشام حسین نمبر" صفحہ ۱۱۳

اور بالخصوص اُردو رسم خط کا معاملہ ایک زمانے تک نرم و گرم گفتگو کا موضوع بنا رہا۔ بعض قابلِ ذکر اردو والے بھی دباؤ بھرے حالات میں اُردو رسم خط کو بدل دینے میں ہی اُردو کی بقا سمجھنے لگے تھے۔ بعض لوگ تو ان مسائل پر زیادہ جذباتی انداز میں اظہار خیال کر رہے تھے لیکن احتشام صاحب ایسے متنازعہ موضوعات پر بھی بڑی متوازن رائے دیتے ہیں۔ اس سے ان کی بصیرت، معاملہ فہمی اور نقطۂ نظر کی وسعت کی مزید نشاندہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری یوں رطبُ للسان ہیں:-

" اُردو ھندی کے مسئلے پر آپ کی مدلّل اور کھری تحریریں ،تقریریں اهلِ فکر کو سوچنے پر اپنی رائے کی نظر ثانی پر مجبور کر دیتی تھیں۔ کون سا ایسا ادبی مسئلہ گزشتہ تیس برس میں اُٹھا ،قابلِ ذکر ادبی تصنیف ایسی نکلی جس پر آپ نے وسعت نظری، سکونِ قلب، گھرے مطالعه اورمنطقی ربط کے ساتھ اپنی رائے نہ دی ھو ---

مغرب کی علمی جستجو نے آپ کو آگاھی اور علمی کاوش بخشی ،طلباء کو اُٹھانے اوراُبھارنے کی نیک خواھش نے آپ کی نیک نفسی کو بُردباری اور سمائی کا درس دیا ، مشرق کے نہایت ھی مھذّب لوگوں سے آپ نے مجلسی آداب پائے ۔ آپ نے بد نصیب رفیقوں سے محّبت کرنا سیکھا،اپنانا سیکھا،اُردو فارسی کے کلاسیکی

ادب نے طبیعت میں گھرائی، لھجے میں نرمی ،
بات میں رچاؤ اور کردار میں لوچ بھر دیا۔" [1]

احتشام صاحب کا گھر سدا مہمانوں سے بھرا رہتا۔ وہ بزرگوں کی ہمیشہ عزّت کرتے، عزیزوں سے شفقت سے پیش آتے اور حاجت مندوں کی ضرورت پوری کرتے۔ وہ اعتدال پسند تھے اور اس اعتدال کو انہوں نے اپنے تمام شعبۂ حیات میں قائم رکھا۔ احتشام حسین لکھنؤ کے بارود خانہ محلّہ میں رہتے تھے جو کہ ہمیشہ بھرا پُرا نظر آتا۔ علی جواد زیدی احتشام حسین کی خانگی زندگی کا یوں نقشہ پیش کرتے ہیں:۔

"احتشام اپنے گھر پر صرف احتشام رہتے، نہ کمیونسٹ نہ باغی ۔جس محّلے میں رہتے تھے اس کا نام بارود خانہ تھا لیکن احتشام کے آنے کے بہت پھلے ساری بارود اُڑ چکی تھی۔ اب یھاں مِہمان خانہ کے سوا اور کچھ نھیں بن سکتا تھا ۔" [2]

احتشام حسین تہذیب واخلاق کے پیکر اور مروّت وشرافت کا مجسمہ تھے ۔ان کی ذات ایک انجمن اور صحیح معنوں میں ایک ادارہ تھی۔ شہرت وغیر معمولی قبولیتِ عام کا بوجھ اُن کے کاندھوں پر جتنا ہلکا معلوم ہوتا تھا اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ انہوں نے مناصِب جلیلہ کی

---

[1] یادوں کے دریچے ماہنامہ " شاہ کار" وارانسی "احتشام حسین نمبر"
[2] بے ساحل سمندر "شاہ کار" وارانسی "احتشام حسین نمبر"

حصولیابی کے لئے بھی خوشامدیں نہیں کیں بلکہ اہم عہدہ حاصل کرنے اور اُسے قبول کرنے سے ہمیشہ وہ گھبراتے تھے۔ احتشام صاحب کو اپنا قلم اور اپنا منصب زیادہ عزیز تھا۔ وہ قلم کے سپاہی بنے رہنا چاہتے تھے۔ دنیاوی جاہ و حشم سے بچتے رہے۔ بحیثیت انسان احتشام صاحب کی ذات میں بڑی کشش اور جاذبیت تھی۔ جن جن پہلوؤں کا ذکر کیا جائے گا روشنی کی کرنیں آنکھوں کو خیرہ کرتی جائیں گی۔ احتشام صاحب کی شخصی زندگی کی طرح ان کی ادبی زندگی کے بھی مختلف پہلو ہمارے سامنے ہیں۔ انہوں نے متفرق موضوعات پر ڈٹ کر لکھا ہے گذشتہ صفحات میں ان کی تحریروں کی طرف اشارتاً ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں ذیل میں تاریخی ترتیب کے ساتھ ان کی تمام کتابوں کی فہرست درج کی جارہی ہے۔ اس کی روشنی میں اُن کے ادبی کارناموں کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے :

ترتیب	کتاب کا نام	نوعیت	باراوّل	پبلشر
۱.	ویرانے	افسانوں کا مجموعہ	۱۹۴۲ء	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ
۲.	تنقیدی جائزے	تنقیدی مضامین	۱۹۴۴ء	ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد
۳.	روایت اور بغاوت	تنقیدی مضامین	۱۹۴۷ء	دارہ اشاعت اردو حیدر آباد
۴.	ادب اور سماج	تنقیدی مضامین	۱۹۴۸ء	کتب پبلشرز لمیٹیڈ بمبئی
۵.	تنقید اور عملی تنقید	تنقیدی مضامین	۱۹۵۲ء	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ
۶.	ذوقِ ادب اور شعور	تنسیدی مضامین	۱۹۵۵ء	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ
۷.	ساحل اور سمندر	سفر نامہ	۱۹۵۴ء	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ
۸.	اردو ساہتیہ کا اتہاس (تاریخ ادب ہندی میں)		۱۹۵۴ء	دانش محل لکھنؤ
۹.	عکس اور آئینے	تنقیدی مضامین	۱۹۶۲ء	ادارہ فروغ اردو لکھنو
۱۰.	افکار و مسائل	تنقیدی مضامین	۱۹۶۳ء	نسیم بک ڈپو لکھنؤ

۱۱	اقبار نظر	تنقیدی مضامین	۱۹۶۵ء	کتاب پبلشرز لکھنؤ
۱۲	اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس	تنقید (ہندی)	۱۹۶۹ء	
۱۳	اُردو کی کہانی	بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کیلئے	۱۹۶۵ء	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ
۱۴	روشنی کے دریچے	شعری مجموعہ	۱۹۷۳ء	احتشام اکیڈمی الہ آباد ۱۵
	سوویت یونین تاثرات اور تجربے	ڈائری	۱۹۸۴ء	نوینگ پریس چاندنی چوک الہ آباد
۱۶	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (تاریخِ ادب)	دوسرا ایڈیشن	۱۹۸۸ء	ترقی اُردو بیورو، دہلی

ترتیب، تلخیص اور ترجمہ

۱۔ تنقیدی نظریات (جلد اول اصول اور فن تنقید کے متعلق ناقدین کے مضامین کا مجموعہ) ۱۹۵۵ء

۲۔ تنقیدی نظریات (جلد دوم) ۱۹۶۶ء ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ

۳۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ۱۹۴۸ء جان بیمز کی کتاب کا ترجمہ مع حواشی
دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

۴۔ آب حیات (محمد حسین آزاد) تلخیص و مقدمہ ۱۹۷۲ نیشنل بک ٹرسٹ دہلی

۵۔ انتخاب جوش کلام جوش کا انتخاب مع مقدمہ کتاب محل پرائیوٹ لمیٹیڈ، الہ آباد

۶۔ گنجی کی کہانی از لیڈی موتر ساگی ترجمہ ۱۹۷۱ء ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی

۷۔ کلکی یا تہذیب کا مستقبل از ڈاکٹر رادھا کرشنن ترجمہ ۱۹۶۱ء پبلیکیشنز ڈویژن، دہلی

۸۔ ہماری سڑک از جان پیٹرسن ترجمہ

9. وویکانند ازرومین رولاں ترجمہ

۱۰. سالومی ازآسکر وائلڈ ترجمہ

۱۱. نقش حالی حصہ اول، دوم حالی پر مختلف ناقدوں کے مضامین ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۲.

۱۲. جگر نمبر (رسالہ فروغ اردو) ۱۹۶۱ء ادارہ فروغ اُردو، لکھنؤ

۱۳. ۱۹۵۳ء کا انتخاب روح ادب سالگرہ نمبر ۱۹۵۴ء

۱۴. سلک گہر اُردو مثنویوں، مراثی اور منظومات کا انتخاب ادارہ فروغ اُردو، لکھنؤ ۱۵.

انتخاب نثر جدید باردوم ۱۹۶۸ء ادراہ فروغ اردو لکھنؤ

۱۶. ادب پارہ حصہ نثر و نظم

۱۷. منتخب ادب، مقالات، غزلیں، نظمیں، کہانیاں، طنز و مزاح، ڈرامہ

حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ان کتابوں کے علاوہ احتشام حسین کے تقریباً تین سو مضامین زبان، تہذیب اور ادب پر اور ادب میں ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشائیہ، سوانح نگاری، ترقی پسند ادب، جدید ادب، نئے ادبی رجحانات، نثر نگاروں اور شاعروں پر مختلف کتابوں، رسائل اور اخبارات میں بکھرے پڑے ہیں۔ تبصرے، تاثرات، اداریے، دیباچے، اور مقدمے کے علاوہ مختلف موضوعات پر اُن کی پچاسوں نگارشات ہمیں دعوت فکر دیتی ہیں۔

اُردو کا یہ عظیم المرتبت ادیب، جلیل القدر نقاد، افسانہ نگار، شاعر، انشاپرداز جمعہ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو صبح آٹھ بج کر چالیس منٹ پر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ احتشام صاحب سے بچھڑنے کے احساس نے ایک زمانہ کا سینہ چھلنی کر دیا۔ کیا دانشور کیا فنکار کیا صحافی،

ادیب، خطیب، نقاد، شاعر، یونیورسٹی کے عملے، احباب، اقارب، اعزہ، شناسا جس نے اُن کی رحلت کی خبر سنی اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ گورنر اترپردیش اکبر علی خاں نے اپنے تعزیتی پیغام میں انہیں ایک جلیل القدر ادیب، مفکّر، مقرّر، معلم اور بڑے انسان کے علاوہ انہیں اُردو ادب کے ایک عظیم معمار اور فنکار کی حیثیت سے یاد کیا۔[1] اس زمانہ کے مرکزی وزیر اندر کمار گجرال نے (جو بعد میں وزیر اعظم بھی بنے) اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا:

".......وہ جتنے بڑے ادیب اور نقاد تھے اتنے بڑے انسان تھے ان کی شخصی ایمانداری اور راست بازی اور دیانتداری ان کی تحریروں میں پھنچ کر ادیب کا ایك مسلك بن گئی"[1]

مُرلی منوہر جوشی الہ آباد یونیورسٹی میں احتشام صاحب کے ہمعصر تھے یوں اعتراف کرتے ہیں،

'میں نے ھمیشہ ان کو پُر سکون ،متوازن اور سنجیدہ پایا ۔کوئی دوسراآدمی ان حالات میں ان کی طرح نھیں رہ سکتا ۔اساتذہ کی حالت کے سدھار کے بارے میں ان کی رائے ھمیشہ نپی تُلی رھتی، ان کی تجویزیں بھت مفید اور قابل قبول ھوتیں ۔"[2]

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اُس دور کو "دور احتشامی"[3] قرار

[1]،[2]،[3] ماہنامہ "فروغ اردو" لکھنؤ "احتشام حسین نمبر"

دیا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ، نے اُنہیں اُس عہد کا سب سے زیادہ مقبول، سب سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ ہر دلعزیز دانشور قرار دیا۔[1] بابو رام سکسینہ وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی نے احتشام صاحب کو ہندوستانی ادبیات کا بہت بڑا عالم قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"ایسا ودّوان اپنے مضمون کا یا یوں کہیں تمام بھارتیہ ادب کا ملنا مشکل ہے۔"[2]

پروفیسر آل احمد سرور کے کرب کا اندازہ درج ذیل سطور سے کیا جاسکتا ہے۔

"احتشام میرے ساتھی تھے، میرے دوست تھے۔ وہ رفاقت کے آداب اور دوستی کے فن کو سمجھتے بھی تھے اور برتتے بھی تھے، ان کی اچانک رحلت سے دل کی زمین میں جو خلا پیدا ہوا ہے، شاید ہی کبھی پورا ہو سکے۔"[3]

ہندی کے مشہور شاعر پنڈت سمترا نندن پنت احتشام صاحب کی موت کی خبر سن کر تڑپ اُٹھے،

"پروفیسر سید احتشام حسین کی موت کی خبر سے لرز سا گیا ہوں۔ الہ آباد کی ادبی سرگرمیوں کے روح رواں کی حیثیت سے احتشام صاحب مجھے ہر

---

[1]، [2]، [3] ماہنامہ "فروغ اردو" "لکھنؤ" "احتشام حسین نمبر"

[4] ماہنامہ "شاہکار" "وارانسی" "احتشام حسین نمبر"

ایک بزم میں نظر آتے رہے ھیں ۔ایسے پر خلوص اور
سچّے انسان دنیا میں کم ھوتے ھیں ۔ "[1]

احتشام صاحب فراؔق گورکھپوری کے شاگرد رہے تھے۔ لیکن اُن کی رحلت پر فراق کی بے کسی ملاحظہ ہو،

"اپنے لائق شاگرد کے اُٹھ جانے سے خود یتیم ھو گیا،شاگرد بیٹا ھوا کرتا ھے لیکن جو بے تصنّع اور رچی ھوئی بزرگی احتشام صاحب کے کردار میں تھی اس کو سوچ کر میں کہتا ھوں کہ ان کی موت ان سے زیادہ عمر والوں کو یتیم کر گئی ۔اتنی خاموش طبیعت اور اتنی یاد آنے والی شخصیت کا سنگم ایک ھی فرد میں مشکل سے سوچا جا سکتا ھے "

مزاج حسن میں کیا اعتدال ہوتا ہے

میں الہ آباد میں بہت دنوں سے ھوں پہلے طالب علم کی حیثیت سے اور اب ادب کے خدمت گذار کی حیثیت سے ھوں ،میں نے نہ جانے کتنوں کی موت دیکھی ھے ۔اس شہر الہ آباد میں پروفیسرس کی موت ، لیکچررس کی موت، ادیبوں کی موت، وائس چانسلر کی موت ۔اتنا ماتم اس شہر میں کسی کا نہ ھوا، جتنا کہ احتشام صاحب کا ۔[2]

---

[1]،[2] ماہنامہ "شاہکار" وارانسی "احتشام حسین نمبر"

ہندی کی مشہور شاعرہ مہادیوی ورما نے اِن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا:-

"پروفیسر احتشام حسین کی نا گھانی وفات سے جو ادب و سماج میں کمی واقع ہوئی ھے اس کا بدل ممکن نھیں -وہ ایك همدرد ، غیر متعصب استاد اور بڑے دوررس ادیب ،حساس اور بے لوث سماجی کارکن تھے -وہ ایسے لوگوں میں تھے جو فرقہ پرستی، سیاست اور ذاتی مفاد سے دُور تھے وہ مساوات کے قائل تھے -آج همارے سماج کو ایسے انسانوں کی سخت ضرورت ھے-" [1]

احتشام حسین کی شخصیت اس قدر رچی ہوئی، تہ دار، ہمہ گیر اور دل آویز تھی کہ جو شخص بھی اُن سے ایک بار ملتا، اُن کا گرویدہ ہو جاتا۔ وہ ہر کسی کی بات کو غور سے سُنتے تھے، دوسروں کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دیتے خود بہت کم کہتے مگر دوسروں کی بات ہمدردی کے ساتھ خاموشی سے سُنتے تھے۔ یہ اُن کی دل آویز شخصیت کا ہی اثر تھا کہ اُن کے انتقال کے بعد ہزاروں تعزیت نامے اُن کے گھر، ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے پاس اور ان کے احباب کے پتہ پر پہنچے۔ اگر میں ان تمام لوگوں کے پیغامات کو یکجا کر دوں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔

ان چند رایوں کو پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ احتشام صاحب

---

[1] مرحوم احتشام حسین - خراج عقیدت "شاہکار" احتشام حسین نمبر

کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا جا سکے۔ وہ اردو کے پروفیسر، نقّاد اور ادیب تھے لیکن ان کی دنیا اردو اور اردو والوں تک محدود نہیں تھی جیسا کہ بابو رام سکسینہ صاحب نے لکھا ہے کہ وہ بھارتیہ ساہتیہ کے ایک بڑے وِدّوان تھے۔ در اصل احتشام حسین ایک دانشور تھے ان کی نگاہ ہندوستانی زبانوں کے ادب پر بھی تھی اور تہذیب پر بھی، وہ قومی اور بین الاقوامی سیاسی اور ادبی تحریکات پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت کے بارے میں سوچتے ہوئے میر کا یہ مصرعہ ذہن میں آتا ہے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

باب دوم

افسانہ نگاری

گذشتہ باب میں احتشام حسین کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی۔
احتشام حسین جن کی تمام تر شہرت ایک نقاد کی حیثیت سے ہے انہیں
اپنے عہد کا سب سے بڑا نظریہ ساز نقاد کہا گیا ہے لیکن یہ ایک بہت
دلچسپ بات ہے کہ احتشام صاحب ایک اچھے تخلیق کار بھی
تھے۔انہوں نے تنقید کے علاوہ بھی مختلف نثری اصناف میں گرانقدر
اضافے کئے ہیں لیکن بحیثیت نقاد ان کی شخصیت اس طرح چھا گئی تھی
کہ ان کی دوسرے ادبی حیثیتوں کی طرف نگاہیں نہیں گئیں۔ خود
انہوں نے اپنی نثری اور شعری تصنیفات کو کبھی اہمیت نہیں دی۔
غالب نے کہا تھا۔

فارسی بیں تا بینی نقش ہائے رنگا رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

شاید احتشام حسین نے بھی اپنی دیگر تصنیفات اور شاعری کو

اپنے لئے بے رنگ سمجھا تھا لیکن آج جب ہم ان کی تخلیقی تصنیفات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ احتشام صاحب ایک اچھے تخلیق کار بھی تھے۔ اُنہوں نے افسانہ نگاری تنقید نگاری سے پہلے شروع کی اور انکے افسانوں کو اس زمانے میں خاصی شہرت بھی حاصل تھی اس لئے اُردو افسانے میں احتشام حسین کی کیا دین (CONTRIBUTION) ہے اس کا مطالعہ خود اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

افسانہ اُردو کی ایک جدید صنف ہے۔ یہ اردو میں انگریزی زبان وادب کے وسیلہ سے آیا۔ اس کے ابتدائی تجربے امریکی افسانہ نگار تھینل ہاتھورن اور ایڈگر ایلن پو نے کئے تھے اور اسے فن کا درجہ چیخوف اور موپساں نے دیا۔ اُردو میں حکایتوں اور قصہ کہانیوں کی روایات پہلے سے موجود تھیں جنہوں نے افسانوں کے لئے راہ ہموار کی۔ جلد ہی نثر کی یہ صنف دیگر تخلیقی نثر سے زیادہ مقبول ہو گئی۔ آج اردو میں افسانہ ایک بے حد توانا اور قابل افتخار صنف ہے۔

اُردو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے؟ اس پر ہنوز اتفاق رائے ہونا باقی ہے۔ انور سدید نے "اردو ادب کی مختصر تاریخ" میں سجّاد حیدر یلدرم کو اُردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیا ہے " اردو کے پہلے افسانہ نگار پریم چند نہیں، سجّاد حیدر یلدرم ہیں، " اور اردو کا پہلا افسانہ پریم چند کا " دینا کا سب سے انمول رتن " نہیں بلکہ یلدرم کا " نشّہ کی پہلی ترنگ " ہے، اس لئے کہ خود پریم چند کے بیان کے مطابق اُن کا پہلا افسانہ " زمانہ " (۱۹۰۷ء) میں شایع ہوا ہے لیکن اس سے سات سال پہلے یلدرم کا افسانہ " معارف " (علی گڑھ) بابت ماہ اکتوبر ۱۹۰۰ء میں موجود ہے۔ بہر حال طے پاچکا ہے کہ پریم چند کا افسانہ

"دنیا کا سب سے انمول رتن" اردو کا پہلا افسانہ نہیں۔ سجاد حیدر یلدرم نے
افسانوں میں نفسیاتی تحلیل کے انداز اور جذبات نگاری کو اہمیت دی نیز
رومانی مزاج کی فراوانی کے باوجود کہیں کہیں تخلیقی سطح کو بھی چھونے
کی کوششیں کیں ہیں۔ پریم چند کے ابتدائی افسانوں پر اگرچہ داستانوی
رنگ غالب ہے لیکن اصل میں وہ انسان کی اُمنگوں، ناکامیوں
اور کامرانیوں کے افسانہ نگار ہیں اور ان کے لئے وہ بیشتر مواد گرد و پیش
سے اخذ کرتے ہیں۔۔۔۔سلطان حیدر جوش دراصل مغرب مخالف
جذبات سے لبریز تھے، چنانچہ انہوں نے افسانوں کے وسیلے سے مغرب
کی کورانہ تقلید کے خلاف آواز اُٹھائی۔ لیکن جوش پر یلدرم کے اثرات
بھی واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یلدرم اور پریم
چند نے اپنی جُدا گانہ روشوں کے لئے الگ الگ کارواں بنائے۔
مثلاً یلدرم کی روش اپنانے والے قابلِ ذکر افراد میں نیاز فتح پوری، مجنوں
گورکھپوری اور حجاب امتیاز علی کا شمار کیا جا سکتا ہے اور سدرشن، فضل
حق قریشی، اعظم کریوی، حامد اللہ افسر، علی عباس حسینی، صادق الخیری،
سہیل عظیم آبادی اور اختر اورینوی وغیرہ پریم چند کی روایت پر اپنے
فن کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یلدرم ادب برائے ادب کے قائل نظر آتے
ہیں، وہ تُرکی زبان کے بہت سارے رومانی افسانوں کو اُردو کا لباس
پہناتے ہیں لیکن پریم چند زندگی کو سماج کے آئینہ میں دیکھنا پسند کرتے
ہیں۔

۱۹۳۵ء میں "انگارے" کی اشاعت ہوتی ہے تو حقیقت نگاری کا
ایک منفرد مزاج انگڑائی لیتا ہے۔ افسانوں کے اس مجموعہ "انگارے"

میں سجاد ظہیر کے پانچ، محمود الظفر کا ایک اور احمد علی اور رشید جہاں کے دو دو افسانے شامل ہیں۔ "انگارے" کی اشاعت کے بعد عام طور پر سوشلزم، مارکسزم اور فرائڈزم کی گونج ہر طرف سُنائی دینے لگی۔ اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا جس کی پہلی کانفرنس کے صدر پریم چند ہوتے ہیں۔ اب اردو افسانوں میں آزادی کی لہر تیز تر ہو جاتی ہے۔ بورژوائی تہذیب کے خلاف احتجاج میں شدّت پیدا ہوتی ہے اور اُردو افسانے کے آنگن میں دھوپ دور تک پھیل جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اور خاص کر پریم چند کے اثرات کے تحت کئی اور بھی بڑے قد کے افسانہ نگار سامنے آتے ہیں جیسے علی عبّاس حسینی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عبّاس، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، حیات اللہ انصاری وغیرہ۔

اردو افسانہ کے اس پس منظر کی طرف متوجہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ احتشام حسین کی افسانہ نگاری کا پس منظر اور پیش منظر دونوں ہمارے سامنے رہیں اور ہم اطمینان سے اُن کی افسانہ نگاری پر گفتگو کر سکیں۔ احتشام حسین نے افسانوں کو کبھی باعثِ افتخار نہیں سمجھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو افسانہ نگاری میں ایک حد تک مقبولیت اور شہرت حاصل کر لینے کے بعد وہ افسانے لکھنا موقوف نہ کرتے۔ بہر حال اُن کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے پیشتر اس بات پر بھی نظر ہے کہ اُن دنوں افسانہ کا مفہوم کیا تھا۔ خود احتشام صاحب اس سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"ایک افسانہ اوردوسرے افسانے میں جو چیز مابہ الامتیاز ہو گی، جو چیز فرق پیدا کرنے والی ہو گی وہ صرف اس لمحہ کی لذّت ہو گی جس لمحہ میں پڑھنے والے نے وہ افسانہ پڑھا ہے ۔اس کے پڑھنے سے جسم میں جو جھُر جھُری پیدا ہوئی، جو لطف پیدا ہوا اور تھوڑی دیر کے لئے اس نے اس میں ایسی خوبیاں محسوس کیں جو افسانے میں ہونی چاھئیں ۔"[1]

ڈاکٹر اختر اورینوی افسانہ کو ڈرامہ کی طرح ایک معجزہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں،

" ایک اچھا افسانہ ایک کامیاب ڈرامہ کی طرح معجزہ ہے۔ باوجود اختصار کے فنّی حیثیت سے وہ ایک حسنِ کامل ہوتا ہے اور اپنے حسنِ تکمیل کی وجہ سے ناظرین کے لئے ذھنی مسرّت کا سامان ۔" [2]

اُردو افسانے کے ایک اہم ناقد وقار عظیم نے اسے جذبہ، احساس اور تاثر کا مظہر کہاہے۔اپنے احساسات کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:۔

"افسانہ کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی اہمیت

---

[1] اعتبار نظر۔ لکھنؤ ۱۹۶۵ء

[2] تحقیق و تنقید صفحہ ۱۱۳

کا مظهر بنا۔ کسی ایک واقعه ،ایک جذبه، ایک احساس ، ایک تاثر، ایک اصلاحی مقصد، ایک روحانی کیفیت کو اس طرح کهانی میں بیان کرنا که دوسری چیزوں سے الگ نمایاں هو که پڑھنے والے کے جذبات واحساسات پر اثر انداز هو،افسانه کی وه امتیازی خصوصیت هے جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا۔ مختصر افسانه میں اختصار اور ایجاز کی دوسری امتیازی خصوصیت نے اس کے فن میں سادگی، حسن ترتیب وتوازن کی صفت پیدا کی هے۔"[1]

سعادت حسن منٹو جس طرح اردو افسانہ نگاروں میں منفرد حیثیت کے مالک ہیں اُسی طرح وہ اپنے نقطہء نظر کے اظہار میں بھی منفرد اور دلکش انداز اختیار کرتے ہیں۔ افسانہ کے خدوخال یوں اُبھارتے ہیں،

" ایک تاثر خواه وه کسی کا هو اپنے اوپر مسلّط کر کے اس انداز سے بیان کر دینا که سُننے والے پر وهی اثر کرے ، یه افسانه هے۔"[2]

مذکورہ بالا چند مثالوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کسی واقعہ کا مختصر طور پر سادگی، حسن ترتیب اور توازن کے ساتھ بیان کرنا جس کا قاری پر اثر ہو وہ افسانہ ہے۔

---

1. داستان سے افسانے تک کراچی ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۶
2. نقوش افسانہ نمبر ۱۹۵۴ء سمپوزیم، محمد طفیل ص ۴۷۸

افسانہ کی تخلیق کی تحریک کس طرح ملتی ہے، کسی کیفیت سے تخلیق کار کس طرح متاثر ہوتا ہے اور اس کی پیش کش میں کتنا توازن اور کس حد تک اس کی جذباتیت کا دخل ہوتا ہے، ہمیں دیکھنا ہوگا۔ ہم روز نئے نئے واقعات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں، ہماری اپنی شخصی اور ذاتی زندگی میں بھی بھونچال آجاتا ہے، سماج اور اردگرد کے ماحول میں نت نئے واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کا اثر ہم پر بلاواسطہ یا بالواسطہ ہوتا رہتا ہے مگر ایک فنکار اِن واقعات میں سے اُن ہی واقعات کا انتخاب کرتا ہے جو دور رس اور سماجی زندگی کو گہرے طور پر متاثر کرنے والے ہوتے ہیں اور پھر اُنہیں اپنے احساسات، مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔ احتشام حسین نے بھی ماحول اور حالات کو افسانوں میں بہت اہمیت دی ہے۔ اپنے افسانوں کے سببِ تخلیق پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:۔

"میں نے زیادہ تر افسانے ایسے لکھے جن کے لکھنے کے لئے میں نے اپنے دل میں کوئی تڑپ پائی۔ بعض افسانوں کا مرکزی تاثر میرے ذہن میں کئی کئی سال تک گھومتا رہا لیکن میں نے کسی وجہ سے اُسے افسانہ کی شکل میں نہیں ڈھالا ۔ کبھی معمولی سی تحریک نے مجھ سے اس تاثر کے گرد افسانہ کا خاکہ کھڑا کرا دیا ہے۔" [1]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مشاہدات اور ذاتی تجربات کے علاوہ احساس کی سطح پر بھی کوئی تحریک جنم لیتی ہے۔ کوئی بھی واقعہ، کوئی عمل

---

[1] ویرانے (دیباچہ) صفحہ ۷

شعوری یا لاشعوری طور پر تخلیق کار کے ذہن و دماغ پر اثر ڈالتا ہے اور کبھی بھی وہ تخلیقی ادب کا محرّک بن سکتا ہے۔

اختشام صاحب کے افسانوں کے مجموعہ ''ویرانے'' میں سولہ (۱۶) افسانے ہیں ''رجو نتی''، ''ایثار''، ''قطرے میں طوفان''، ''ہنگامۂ ہستی سے دُور'' اور ''مقناطیس'' ۳۳ء اور ۳۴ء میں لکھے گئے ہیں جنہیں انہوں نے پریم چند، نیازؔ فتح پوری، اعظم کریوی اور علی عباسؔ حسینی کے نام معنون کیا ہے اور ''کھنڈر''، ''دوسرا نکاح''، ''بیزاری''، ''مجبوریاں''، ''اس کا بچّہ''، ''حرارت، دعوت''، ''گورکن''، ''رانی'' اور ''جنگ'' ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ جنہیں انہوں نے نئے افسانہ نگاروں کے نام معنون کیا ہے۔ اختشام حسین کے افسانوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد درج ذیل نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں:-

۱۔ سماجی درجہ بندی (امیر و غریب، اونچ نیچ وغیرہ) کے خلاف جذبات ترقی پسند تحریک سے قبل ہی پیدا ہو چکے تھے اور پریم چند وغیرہ ہراول دستہ تھے۔

۲۔ محبّت کے سلسلہ میں اختشام صاحب کا انداز جذباتی سے زیادہ فلسفیانہ ہے۔ وہ نیاز فتح پوری، سجّاد حیدر یلدرم اور کچھ بعد کے افسانہ نگار جیسے اخترؔ اور رینوی وغیرہ کی طرح محسوسات کی تصویر کشی کے ذریعہ شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز بیان سے دلکشی اور دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اختشام صاحب اپنے دیباچہ میں خود اعتراف کرتے ہیں کہ نیاز فتح پوری کے انداز بیان سے وہ متاثر تھے۔

۳۔ ابتدائی منظر کشی کو اگر حذف بھی کر دیا جائے تب بھی افسانے میں کسی خلاء کا احساس نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر "ہنگامۂ ہستی" کے ابتدائی چند سطور کو الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔

۴۔ سماجی واقعات کی تصویر کشی (اگرچہ فلسفیانہ انداز سے بوجھل ہوتی ہے) زیادہ صاف ستھری اور پُر اثر ہے مگر محبت کے مناظر مشینی انداز سے گذرتے دکھائی دیتے ہیں۔

۵۔ کردار نگاری میں بھی افسانہ نگار کے اپنے تاثرات زیادہ ہوتے ہیں اور کردار کے عمل اور رد عمل، اندرونی کشمکش یا مختلف نفسیاتی پیچیدگیوں کا اظہار برائے نام ہوتا ہے۔

۶۔ عام گفتگو ہو یا اہم مکالمہ اردو کے ابتدائی ڈراموں کے انداز جیسے نظر آتے ہیں۔ جو فطری سے زیادہ میکانکی نظر آتے ہیں۔

۷۔ تاثرات کو اُبھارنے کے مرحلہ میں افسانہ نگار خود جذباتی ہو جاتا ہے اور جذبات کے روش پر مواد کو پُر اثر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

۸۔ احتشام صاحب بھی قصوں، کہانیوں، داستانوں اور حکایتوں کے مزاج کو اپناتے ہوئے محبت کو پاک اور بے غرض سمجھتے ہیں اور اسی انداز میں اسے پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں قربانی پیش کرنا، ضبط سے کام لینا اور محبوب کے حاصل نہ ہونے پر بھی اس سے محبت کرنا اور وفا کا سلسلہ قائم رکھنا جزو عشق سمجھتے ہیں۔ یہ نقوش ان کے افسانوں میں جگہ بہ جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

فنِ افسانہ کے سلسلہ میں ناقدینِ ادب کی اپنی اپنی رائے

ہے۔ کسی نے اسے محض معروضی انداز اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے اور یہ پتہ لگایا ہے کہ افسانوں میں زندگی کے پہلوؤں کو کس طرح پیش کیا گیا ہے۔اس میں تنقید کے بجائے تجزیہ اور تحلیل سے کام لیا جاتا ہے۔ کچھ نقّاد افسانوں کا مطالعہ افسانہ نگار کی نفسیات اور اس کے تجربوں کی نوعیت اور مقصدِ اظہار کی روشنی میں کرتے ہیں۔ کچھ افسانوں کو سماجی دستاویز کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں افسانے کے عہد اور اس کے ارتقا کو پس منظر بنا کر مواد کے انتخاب اور پھر پیش کش اور اسلوب پر نظر رکھنی چاہیئے۔ نفسیاتی گتھیوں، سیاسی اور سماجی نیز اقتصادی بنیادوں کو بھی سمیٹ کر چلنے سے مجموعی طور پر جو احاطہ ہوتا ہے اس سے افسانہ کی روح کے قریب تر پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

احتشام صاحب کے افسانے اُس دور میں لکھے گئے جب رومانیت انگڑائیاں لے رہی تھی۔افسانوں میں عبارت آرائی اور خیال آفرینی کے ساتھ ساتھ خواب وخیال کی دنیا آباد کی جا رہی تھی۔اُن کے سامنے تقسیم ہند اور فسادات جیسے سلگتے ہوئے مسائل نہیں تھے۔ انسان کا داخلی کرب بھی سطح پر اُبھر کر نہیں آیا تھا۔احتشام حسین "ویرانے" میں تحریر کرتے ہیں:-

"میں داخلی حقیقتوں کا مُنکر نہیں ہوں لیکن جانتا ہوں داخلی حقیقتیں خارجی حقیقتوں کا عکس ہوتی ہیں اور کبھی نتیجہ۔اس لئے داخلی حقیقتوں کا اس طرح بیان کہ اُن کا تعلق خارجی حقیقتوں سے زیادہ نہ ہو میرے خیال میں حقیقت نہیں ہے۔" [1]

---

[1] ویرانے (دیباچہ)

انہوں نے امیر و غریب ،اونچ نیچ ،ذات پات ، عشق و محبت ، جنس، احساس کا کرب اور سماجی بندشیں وغیرہ جیسے موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ ''مجبوریاں'' میں گیادین، منوہر لال ٹھیکدار اور لکھیا کے کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ گیادین مزدور جب بیمار پڑتا ہے تو اس کی بیوی لکھیا خود کو چند سکوں کے عوض بیچ دیتی ہے۔ افسانہ نگار نے ماحول کو پُر اثر بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ غریبی اور بے بسی کی تصویروں میں جان ڈال دیتا ہے۔ موسم کے سہانے پن اور عورت کے داخلی تقاضوں اور کرب کو پیش کرتے ہوئے قاری کے ذہن پر یہ بات ثبت کرنا چاہتا ہے کہ مجبوری میں اٹھائے گئے قدم کو انسانی ہمدردی کی ضرورت ہے۔ ''قطرے میں طوفان'' نندی چمارن اور منوہر بابو برہمن کی محبت کی داستان ہے۔ منوہر بابو نندی سے بے انتہا عشق کرتے ہیں، اس سے شادی کا وعدہ بھی تھا اور اس وعدہ کو پورا بھی کرنا چاہتے ہیں مگر سماجی نظام اور گھریلو بندشوں کے آگے وہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ اُن کی شادی ایک برہمن لڑکی سے کر دی جاتی ہے۔ نندی ان سے دُور ہو جاتی ہے مگر منوہر بابو اپنی بیوی سے کسی طرح جذباتی رشتہ استوار نہیں کر پاتے۔ دوسری طرف منوہر بابو کی بیوی زخمی کبوتری کی مانند تڑپتی رہتی ہے ۔احتشام صاحب کا یہ افسانہ ''قطرے میں طوفان'' انسانی جذبات، نفسیاتی پیچیدگی اور سماج کی بے رحم بندشوں کو پیش کرتا ہے۔ احتشام حسین کا ایک افسانہ ''دوسرا نکاح'' ہے ۔اس افسانہ کے متعلق ڈاکٹر سیّد محمد عقیل ''آہنگ'' گیا کے احتشام حسین نمبر میں ایک واقعہ لکھتے ہیں جس کے مطابق اس کہانی کے شائع ہونے کے بعد کافی ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا۔ محمد علی پارک (الہ آباد کا ایک محلہّ) کے

ایک مکان سے ''انیس'' نام کا ایک رسالہ شائع ہوتا تھا اسی میں یہ کہانی چھپی تھی۔ لوگوں کی ایک بھیڑ نے اس کہانی کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے ''انیس'' کے دفتر میں آگ لگادی۔ ''دوسرا نکاح'' میں شکور اور فخرن کی محبت کی داستان ہے۔ بزرگوں کے طے کئے ہوئے رشتے کے مطابق شکور اور فخرن کی شادی ہو جاتی ہے۔ دونوں ہنسی خوشی ازدواجی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ شکور بمبئی جاکر بڑی محنت و مشقت کرتا ہے۔ کافی دنوں کے بعد اس کی واپسی ہوتی ہے اور فخرن اور شکور ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔ اسی درمیان فخرن کا بھائی ماں باپ کے اصرار پر گھر واپس آجاتا ہے لیکن وہ اپنے ساتھ ایک عورت کو لے کر آتا ہے جو ذات کی مہترانی تھی۔ چونکہ فخرن کا بھائی کم ذات عورت کو گھر لایا یہ بات اس کے سماج اور اس کی برادری کو سخت ناگوار ہوتی ہے۔ سماج والے شکور کے گھر والوں پر زور ڈالتے ہیں کہ شکور اپنی بیوی فخرن کو طلاق دیدے اس کا احتشام صاحب فلسفیانہ تجزیہ اِس طرح کرتے ہیں:

'' اس دنیا میں ایسے واقعات بھی ہوتے رہتے ھیں کہ نا معلوم طور پر ایک دُور افتادہ کڑی کے گر جانے سے ساری زنجیر میں جھنکار پیدا ھوجاتی ھے......

کمزوری اور آزادیٔ رائے کی کمی، اور پست ہِمّتی اور زبوں حالی غریب طبقہ کی مِلک ھے۔'' [1]

شکور کے لئے طلاق نامہ تیار ہوتا ہے۔ دونوں شوہر بیوی جبراً اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ سماج نے دونوں کو جدا کردیا۔ مذہبی

---

[1] ویرانے (دیباچہ) صفحہ ۲۷۔۲۶

روسے دونوں کو الگ رہنے پر زبردستی راضی کرایا گیا لیکن یہ مذہبی بندشیں شکور اور فخرن کو پسند نہیں آتیں۔ وہ دونوں مذہب اور سماج سے بغاوت کرتے ہیں۔ ان کے فیصلے اور رویئے پر احتجاج کرتے ہوئے اگلے ہی موڑ پر ایک بار پھر مل کر ساتھ رہنے لگتے ہیں۔

اس افسانہ کے مطالعہ کے بعد ایسا لگتا ہے کہ احتشام حسین سماجی بندشوں کے خلاف ابتدا ہی سے جذباتی تھے۔ ان کے اندر بغاوت کی چنگاری ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل ہی پیدا ہو چکی تھی۔ دوسری اور اہم بات جو اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ احتشام صاحب مذہب کے خلاف بغاوت کرنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ حوصلہ آج سے چالیس برس پہلے پیدا ہونا واقعی بڑی جرأت کی بات تھی۔

''حرارت'' میں کلوا ایک اہم کردار ہے۔ کلوا داروغہ جی کے نظرِ کرم کا نتیجہ تھا۔ داروغہ جی طبیعت دار آدمی تھے۔ روز ایک ہی ہانڈی میں کھاتے کھاتے اکتا جاتے تو کلوا کی ماں کو بھی نظر بچا کر دیکھ لیا کرتے، جو اس گھر کی نوکرانی تھی۔ کلوا اُس ڈھکی چھپی محبت کا نتیجہ تھا۔ کلوا کی ماں مر جاتی ہے لیکن کلوا داروغہ جی کا نوکر بنا رہتا ہے۔ ایک سخت گیر مالک کے نوکر کی طرح اس نے دبے دبے اور سہمے سہمے رہنا سیکھا تھا۔ اس کے لاشعور میں یہ جڑ پکڑ گیا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ دھیرے دھیرے اس کے داخلی جذبات، احساسات اور دل کی دھڑکنیں مُردہ ہوتی چلی گئیں۔ اسی درمیان نورن جو کہ ایک بیوہ ہے اس گھر میں آکر پناہ لیتی ہے۔ ایک سردی رات میں ایک ہی کمبل کے نیچے وہ کلوا

کے اس قدر قریب آجاتی ہے کہ ساری دُوریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس قُربت نے کلوا کے تن میں اتنی حرارت پیدا کر دی، اُس کے جسم کے اندر ایسی گرمی بھر دی، ایسا سُرور اُسے دیا، ایسی خود اعتمادی اُسے بخشی کہ دوسرے دن ایک دُکاندار کے محض کلوا پکارنے پر وہ اُس سے لڑ بیٹھتا ہے۔

احتشام حسین کے افسانے مظلوم طبقہ کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ سماجی رسم ورواج، بندھنوں اور زنجیروں کو اُتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ اُن کے یہ افسانے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ ''کھنڈر'' نیا ادب میں ''بیزاری'' اور ''رانی'' ادب لطیف کے افسانہ نمبروں میں ''حرارت'' ساقی کے سالنامہ میں ''دعوت'' اور ''مجبوریاں'' اضطراب کے خاص نمبروں میں ''دوسرا نکاح'' انیس میں ''گورکن'' نگار میں اور ''اس کا بچہ'' پرچم میں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں احتشام صاحب کے افسانے بہرحال مقبول تھے اور اس وقت کے اہم رسائل وجرائد میں شائع ہوا کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دور ادب میں رومانوی افسانوں کا دور تھا اور احتشام صاحب کے افسانوں کے موضوعات سماج کے سلگتے ہوئے مسائل تھے۔ عابد سہیل ''ویرانے۔ ایک مطالعہ'' میں رقمطراز ہیں:۔

'' احتشام صاحب کے افسانوں کی تعداد بے حد مختصر ھے،لیکن یہ افسانے اس بات کی نشاندھی ضرور کرتے ھیں کہ اگر انھوں نے

افسانہ نگاری ترک نہ کی ھوتی تو وہ اردو افسانہ کو اس قدر کم مالا مال نہ کرتے جتنا انھوں نے تنقید کو کیا" [1]

دوسری طرف ڈاکٹر اخلاق کا خیال ہے کہ:-

" احتشام حسین نے افسانہ نگاری کئی بار ترک کی اور کئی بار اختیار کی۔اس ترک اور اختیار میں انھوں نے افسانہ نگاری کو تنقید نگاری سے کمتر نہیں سمجھا ۔انھیں افسانہ نگاری ترک کرنے پر تاسُف بھی ھو ا اور تکلیف بھی ۔افسانہ نگاری چھوڑنے کے بعد بھی وہ افسانہ میں پوری دلچسپی لیتے رھے اور اس کا ثبوت ان کے وہ مضامین ھیں جواُن کے تنقیدی مضامین کے مجموعوں "عکس اور آیئنے " "روایت اور بغاوت" "افکار ومسائل " "ادب اور سماج " "ذوقِ ادب اور شعور " "تنقید اور عملی تنقید " "اعتبارِ نظر "میں شامل ھیں ۔" [2]

احتشام حسین نے جن چار اجزائے ترکیبی پر اپنے دیباچہ میں زور دیا ہے وہ ذہنی تحریک، اختصار، خارجی حقیقت نگاری اور افسانوی دلکشی ہے۔یہ درست ہے کہ یہ چار عناصر کسی افسانہ کے بنیادی اجزاء ہیں

---

[1] ماہنامہ "آج کل " نی دہلی مارچ ۱۹۸۳ء

[2] "احتشام حسین اور فنِ افسانہ "فروغِ اردو (احتشام حسین نمبر فروری ۱۹۷۳ء) صفحہ ۲۸۵

لیکن موضوع کے انتخاب میں مہارت، پلاٹ پر فنّی گرفت، کردار کی عمدہ پیش کش، دلکش اسلوب بیان اور تکنیک میں توازن سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ احتشام حسین کے افسانہ اس وقت کے افسانے ہیں جب اُردو افسانہ اپنے ابتدائی دور میں تھا۔ اس لئے اُن کے افسانوں کا مطالعہ اُس عہد کے پسِ منظر کو سامنے رکھ کر کرنا ہوگا تب ہی احتشام حسین کی جسارت اور نئی دنیا کی طرف پیش قدمی کی ہم داد دے سکیں گے۔ احمد یوسف اپنے مقالہ ''احتشام حسین کے افسانے'' میں رقمطراز ہیں:۔

> ''یہ افسانے مصنف نے اندرونی ارج (URGE) کی بِنا پر لکھے ھیں جن میں داخلی حقیقتیں خارجی حقیقتوں کے زیر نگیں ھیں ۔جن میں دلکشی کا خیال رکھا گیاھے۔خارجی حقیقتیں جنگ اور ہندوستان کا جمود ھیں ۔ھر چند کہ یہ افسانے تعمیر کا کوئی مخصوص تصّور پیش تو نھیں کرتے۔'' [1]

احتشام حسین مقصدی ادب کے قائل ہیں وہ تخلیق کی بلندی مقصد کی تکمیل کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ''مقصد کے بغیر کوئی اعلیٰ تخلیق ناممکن ہے۔'' اور عدم مقصدیت ایک طرح کا فریب ہے۔ احتشام صاحب ترقی پسند خیالات کو مادّی اور سماجی شعور کے انسانی اعمال کی توضیح کی بنیاد بنا کر سماج کے کمزور اور پسماندہ طبقے کی تصویر

---

[1] ماہنامہ ''آہنگ'' گیا احتشام حسین نمبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۳۸

کھینچتے ہیں اور ان کی ذہنی کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کے افسانوں کے موضوعات عشق و محبّت ، معاشی اور سیاسی مسائل، عمل اور خیال سب ایک دوسرے میں گتھے ہوئے ہیں ۔ان کے یہاں کرداری افسانے کم اور واقعاتی افسانے زیادہ ملتے ہیں ۔احتشام حسین کے افسانوں کے کردار مایوس اور غمزدہ سماج کے آگے گھٹنے ٹیکنے والے اور بے حرکت ہیں۔ شکور واحد ایسا کردار ہے جو بغاوت کرتا ہے۔ مکھیا ہو یا رانی، کلوا ہو یا شاکر سبھی مجبور و بے بس نظر آتے ہیں۔یونس اگاسکر کا خیال ہے:۔

" احتشام صاحب کے افسانوں پر ایک افسردگی سی چھائی معلوم ہوتی ہے ۔ان کے کردار زندگی کے بارے میں پُر اُمید نہیں ہیں۔زندگی کے ریلے میں وہ تنکوں کی طرح بہے چلے جا رہے ہیں ۔ان کی خوشیاں مختصر اور غم طویل و ہولناک ہیں۔ احتشام صاحب نے اپنے کرداروں کو زندگی سے بر سر پیکار بنانے کے بجائے سمجھوتہ کرنے پر مجبور بنایا ہے ۔اگر وہ لڑنے پر آمادہ ہوتے بھی ہیں تو اچانک کسی وقتی تحریک کے زیر اثر، کسی ارادی قوت کے بل بوتے پر نہیں ۔'دوسرا نکاح' کے شکور اور فخرن ، 'بیزاری' کا میں اور 'اس کا بچّہ ' کا شاکر اور 'حرارت' کا کلوا اچانک حرکت و عمل کے حامل بن جاتے ہیں لیکن ہم یہ جانتے ہیں، کہ ان کی یہ کیفیت

دیر پا یا مستقل نہیں۔" [1]

احتشام صاحب حقیقت پسند ہیں۔ وہ انسانی مسائل پر نظر رکھتے ہیں۔ دھیرے دھیرے احتشام صاحب سماجی درجہ بندی، توہمات، محض خواب دیکھنے اور محض فلسفہ کے سہارے جینے جیسے نظریات کو رد کرنے کے لئے گویا افسانے لکھتے ہیں۔ "کھنڈر"، "دوسرا نکاح"، "رانی" وغیرہ ایسے ہی افسانے ہیں۔ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ترقی پسند نظریات گویا احتشام حسین کے دیرینہ خواب تھے جو ۱۹۳۵۔۳۶ء کے بعد اچانک گمشدہ جنت کی طرح احتشام صاحب کو مل جاتے ہیں اور وہ باقاعدہ ان کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:-

"داخلی تصورات کی مدد سے خارجی حالات کا بدلنا بے طاقت اور کمزور انسانوں کو ہمیشہ آسان معلوم ہوا ہے۔ خیال اور عمل کی درمیانی خلیج نے بڑی بڑی حکومتوں کے تختے اُلٹ دئیے ہیں پھر جاگا اور رانی کس شمار میں تھے۔" [1]

حقیقت یہ ہے کہ انسان جو کچھ دماغ میں خیال لاتا ہے، وہ اپنے فہم وادراک سے جو نکتے اخذ کرتا ہے وہ تخلیق میں معاون ہوتے ہیں۔ تخلیق ذہانت وذکاوت کی محتاج ہے۔ فہم وبصیرت جب تک بالیدہ اور

---

[1] روشن دماغ افسانہ نگار۔ شاہ کار (وارانسی) ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۰-۳۰۹

[1] ویرانے (افسانہ "رانی")

شعور پختہ نہ ہو، کوئی بھی شخص اچھا تخلیق کار نہیں بن سکتا۔شاید یہ خیال احتشام صاحب کا بھی تھا وہ لکھتے ہیں:۔

"حقیقت افسانہ کی روح میں گتھی ہوئی ہے بشرطیکہ افسانہ نگار محض داستان گو بن کر نہ رہ جانا چاہتا ہو۔بلکہ انسانی روح کا انجنیئر ہونے کی حیثیت سے اپنی بصیرت کے اظہار میں کوتاہی کا مجرم نہ ہوناچاہئیے۔ معمولی آدمی بڑا شاعر یا افسانہ نگار نہیں بن سکتا ۔یہاں معمولی انسان کہہ کر کسی قسم کا طبقاتی زینہ بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ اس سے ہر وہ شخص مراد ہے جس کی بصیرت معمولی ہے اورجس میں ذمّہ دارانہ طور پر انسانی مسائل کو سلجھنے اور سلجھانے کا شعور نہیں ہے ۔نظام زندگی کو پوری طرح سمجھنا اور پھر ان سب کو زماں ومکاں کی وسعت میں متحرك دیکھنا یہی چیزیں انسانی کردار ،اس کی امنگوں اور تمنّائوں ،اس کی فتح اور شکست ،اس کی ترقی اور پسپائی کی صحیح تصویر کھینچنے میں افسانہ نگار کی مدد کر سکیں گی اور وہ حود اعتمادی کے

ساتھ معمولی معمولی واقعات میں زندگی کی
پوری مشین کی حرکت دکھا سکے گا۔افسانے
میں اس مکمل حکیمانہ حقیقت کی آمیزش
افسانہ کو کسی طرح کا نُقصان پہنچائے بغیر
اسے زندگی کے قریب کردے گا۔" [1]

احتشام حسین نے اپنی ایک تہائی کہانیاں اس وقت لکھیں جب کہ ترقی پسندی کا زور نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے روسی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کے ترجمے بڑی تیز رفتاری سے اردو رسائل میں شائع ہونے لگے تھے اور بہترین مغربی افسانوں کے معیار نگاہوں کے سامنے آگئے تھے۔ "ان ترجموں نے موضوع کے انتخاب 'پلاٹ کی تعمیر ،ڈرامائی خاتمہ اور تکنیک کے تنوّع کی طرف متوجہ کیا لیکن محض نقالی کے بجائے یہ اثر بڑی خاموشی سے افسانہ نگاروں کے شعور میں داخل ہو گیا۔" [2]

احتشام صاحب کی کہانیاں اپنے زمانے ،اپنے ماحول کے اِرد گرد گردش کرتے ہوئے کرداروں سے بھری نظر آتی ہیں۔ وہ پس ماندہ طبقے کو نہیں للکارتے بس ذرا اشارہ کردیتے ہیں۔ اس سلسلے میں احمد یوسف اظہار خیال کرتے ہیں:-

"ان کی کہانیاں دُکھ درد کی رفیق ھیں ۔ظالم
اور مظلوم کی جنگ میں مظلوم اور استحصال

---

[1] روایت اور بغاوت۔ سید احتشام حسین [illegible] عکس اور آئینہ ۔ احتشام حسین

شدہ طبقے کا ساتھ دیتی ہیں۔ ان میں بیرونی اقدار
اور جنگ کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات کا ذکر
بھی ملتا ہے، عمل کا پہلو بھی ہے اور افکار رفتہ
رسم و رواج پر ٹھوکریں لگانے کا رجحان بھی۔[1]

احتشام حسین کی کہانیوں کے پلاٹ سادہ، منظّم اور مربوط ہیں۔ ان میں کہانی کے آغاز وسط اور انجام کے درمیان ربط و تسلسل ملتا ہے۔ قاری کا تجسّس آخری وقت تک قائم رہتا ہے۔ وہ مرکزی پلاٹ کے علاوہ کہیں ضمنی پلاٹ میں الجھاتے نہیں۔ اظہار کی بھرپور طاقت، تصادم، کشمکش، مستقبل کا اشاریہ، تجسّس، بر عکس رد عمل اور بصیرت کی روشنی ہمیں ان کے یہاں ملتی ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کو بیانیہ انداز میں شروع کرتے ہیں۔ کہانی کی ابتدا ہی میں افسانے کے کردار، اس کی زندگی، عمل اور پس منظر کی معلومات فراہم کر دیتے ہیں تاکہ قاری ابتدا ہی میں کہانی سے جڑ جائے۔ کہانی لکھنے سے پہلے احتشام حسین اینٹ، ریت اور سیمنٹ سے ایک مکان تعمیر کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں اپنے نظریات اور تصوّرات سے اپنی تخلیقات کو محفوظ رکھ لینا ممکن نہیں۔ ان کے مطابق:۔

" افسانے کی تخلیق میں مَیں کسی غیر شعوری
جذبہ کی کارفرمائی کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ نہیں
مانتا کہ کوئی افسانہ نگار کاغذ قلم لے کر بیٹھ

1۔ احتشام حسین کے افسانے۔ احمد یوسف آہنگ گیا، احتشام حسین نمبر ۱۹۷۳ء۔

جاتا ھے اور لاشعور کی تحریك پر ایك افسانه لکھ دیتا ھے ۔میں سمجھتا ھوں که وه اس کو کنسٹر کٹ (CONSTRUCT) کرتا ھے ۔اس کا عمل تعمیری، تخلیقی اور شعوری ھوتا ھے اور اس لحاظ سے اسے اپنے خام مواد کو ایسی شکل میں پیش کرنا پڑ تا ھے جو اس کے خیالات اور جذبات سے ھم آھنگ ھے ۔وه یه نھیں کر سکتا که اپنے جذبات اور ضمیر کی آواز کے خلاف اسے وھاں جاکر ختم کر دے که جھاں اس کا ضمیر اس کے خلاف احتجاج کرتا رھا ھو۔" [1]

احتشام حسین نے اس خیال کا اظہار کافی قبل کیا تھا۔ اردو افسانے میں نت نئے تجربے ہوئے اور متعدد ایسی کہانیاں ہمارے سامنے آئیں جن میں تسلسل نہیں پایا جاتا اور کہانی بیان کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ملتا۔

آزادی کے بعد ہندو مسلم فساد کے موضوع پر کئی اچھی کہانیاں لکھی گئیں۔ دیہاتی زندگی اور کسان کی بیداری، شہری زندگی اور اس کے مسائل، جنس اور عورت کے مسائل، جاگیردارانہ تہذیب کا زوال اور اس کے اثرات ہماری کہانیوں کے خاص موضوعات بنے اور ساتھ ہی عشق و محبت پر بھی کئی اچھی کہانیاں لکھی گئیں۔

احتشام حسین کا دوسرا پسندیدہ موضوع عشق و محبت ہے۔ اس

ا۔ اعتبار نظر۔ احتشام حسین

سلسلے کی کہانیاں "ہنگامہ ہستی سے دور"، "مقناطیس"، "رجو نتی"، "ایثار"، "قطرے میں طوفان" وغیرہ ہیں۔ یہ ساری کہانیاں ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان لکھی گئیں۔ یہ عہد احتشام حسین کے شباب کا عہد ہے۔ اس وقت شعور اور خرد اور جنون کے درمیان فیصلہ کرنے میں فرض جنون کی طرف جھک جاتا ہے۔ ہر واقعہ کو افسانہ بنادینے میں اور عشق کی داستانِ بیان کرنے میں مزہ آتا ہے۔ اس عہد میں احتشام حسین پر نیاز فتح پوری کی طرز نگارش کا اثر تھا جو ساری طاقت عبارت آرائی پر صرف کرتے ہیں۔ احتشام حسین بھی عبارت آرائی پر کافی زور دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں شاعرانہ عبارت آرائی عام طور پر ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو چند مثالیں:۔

> " تشبیہ واستعارات ،الفاظ اور جملے جو زنگ آلودہ اسلحے ھیں جن کی حقیقت ایسے ھی موقع پر بے نقاب ھو جاتی ھے ۔میں نے اسے دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ الفاظ کی شکل میں میرے ذھن میں نھیں ھے بلکہ ایك تصویر کی طرح اس وقت بھی میرے روبرو ھے ۔اسے شاعروں اور افسانہ نگاروں کے ان نقوش میں نہ ڈھونڈ ئیے جھاں عورت حور وپری سے زیادہ عجیب الخلقت ھوتی ھے جھاں آنکھیں پڑھتے پڑھتے سارے چھرے پر بھی کافی نھیں ھوتیں ۔جھاں ھونٹ طلوع ھلال سے بھی زیادہ باریك ھوتے ھیں، جھاں ھوا کے سرد

ونرم جھونکے اعضاء میں ڈھل جاتے ھیں ۔جھاں عارضوں کی سرُخی نگاھوں میں خیر گی پیدا کر دیتی ھے۔" [1]

" حسن کا جسم مختلف اسلحوں سے آراسته ھوتا ھے لیکن عشق کے نیام میں ایك لکڑی کی تلوار بھی نھیں ھوتی ۔" [2]

"دونوں روپئے چاند کی روشنی میں کبھی کبھی چمك جاتے ۔خون کے دھّبوں کی طرح وہ زمین کی پیشانی پر دوزخم معلوم ھوتے تھے۔" [3]

"وہ بھوك کی راہ میں غازی یا شھید بننا چاھتے تھے۔" [4]

---

[1] قطرے میں طوفان مشمولہ ویرانے احتشام حسین

[2] مقناطیس مشمولہ ویرانے احتشام حسین

[3] مجبوریاں مشمولہ ویرانے احتشام حسین

[4] دعوت مشمولہ ویرانے، احتشام حسین

"پولیس کے سپاہی خدائی فوجدار کی طرح
اس کی عظمت اور چال چلن کے نگران بھی
تھے اور مالک بھی۔" [1]

"بھوک کے اس طوفان میں اس کے خیالات بہے
جارہے تھے۔" [2]

ان اقتباسات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام حسین اپنے افسانوں میں عبارت آرائی اور شاعرانہ زبان پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ وہ ایسی تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں جو بالعموم شاعری میں ہی نظر آتی ہیں۔ شاید اس کا سبب بھی ان کے عہد کی وہ رومانیت ہے جو جذباتی سطح پر بھی ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے اور زبان کی سطح پر بھی۔

احتشام حسین کے شروع کے افسانے خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ "قطرے میں طوفان" اور "مقناطیس" بھی روایتی افسانے کے انداز میں لکھے گئے ہیں لیکن ان میں عورت کے ان جذبات کو پیش کیا گیا ہے کہ وہ یہ پسند نہیں کر سکتی کہ اسے کسی کے بدل کے طور پر چاہا جائے۔ وہ طفیلی محبت کو برداشت نہیں کرتی اور اسی لئے نور جہاں ایک اچھی ایکٹریس ہوتے ہوئے بھی زمرد کا رول بہت خراب ادا کرتی ہے اور زمرد کا بیڑہ غرق کرنا چاہتی ہے۔ اس طرح یہ افسانہ نفسیات کی

---

[1] "وارث" مشمولہ "ویرانے" احتشام حسین

[2] "دعوت" مشمولہ "ویرانے" احتشام حسین

گرہیں بھی کھولتا ہے۔ اسی طرح "بیزاری" بھی ایک حد تک نفسیاتی افسانہ ہے جو ذہنی رو کو راستہ پر لگانے کے لئے کسی جھٹکے کی راہ ہموار کرتا ہے اور آخر میں احمد کا گرم گرم اور تازہ خون جھٹکا بنتا ہے اور ذہنی رو گویا داستان بناتی ہے۔ ورنہ بیزاری کی حالت میں ہال کی سفیدی ایک طویل کفن اور خود ہال گورستان نظر آتا ہے۔ "قطرے میں طوفان" ذات پات کی مخالفت میں اٹھائی گئی آواز، راکھ کے اندر دبی ہوئی چنگاری ہے جو آگے چل کر شعلہ کی شکل اختیار کرتی ہے اسی لئے احتشام حسین تحریر کرتے ہیں:۔

"ان افسانوں کا مصنّف افسانہ نگار سے زیادہ نقّاد ہے......اس کی فنّی صلاحیتیں بہت اعلیٰ درجہ کی نہ ہوں ،تخیل اچھے فنکار کی نہ ہوں،اس کے نقوش اورخطوط گھرے نہ ہوں، اس کی تصویروں میں رنگ دھندلے ہوں ،اس کے کردار بے جان ہوں، اس کے اشارے مبہم ہوں اور اس کی زندگی کی ترجمانی ناقص ہو پھر بھی اپنی بساط بھر اس نے کوشش ضرور کی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں زندگی کی وہ جھلك ضرور دکھا سکے جسے اس نے دیکھا اور سمجھا ہے۔" [1]

---

[1] دیباچہ "ویرانے" احتشام حسین

احتشام حسین کے افسانے آج کی افسانہ نگاری سے متعدد سطحوں پر رشتہ قائم کرتے ہیں۔انہوں نے بیانیہ انداز کو اپنایا، کچھ افسانوں میں شعری زبان کو چھوڑ کر بیشتر مقامات پر وہ تکلفات اور غیر ضروری آراستگی سے آزاد رہے۔انہوں نے افسانے میں داخلی ہم آہنگی کے آداب کو برقرار رکھا اور بقول عابد سہیل:۔

" انہوں نے حقیقت پسندی کو اس طرح برتا کہ خارجی دنیا کی تصویر کشی اور حقیقت پسندی کا فرق واضح ہو گیا۔" [1]

احتشام صاحب کا شمار اُردو کے اہم افسانہ نگاروں میں نہیں ہوتا انہیں اسلوب پر قابو ،زبان پر قدرت اور بیان کی طاقت میسّر تھی۔ تکنیک اور موضوع کی پیش کش میں بھی وہ مہارت رکھتے تھے پھر جو افسانوں کی لہر چل رہی تھی اور ۱۹۴۲ء تک "زندگی کے موڑ پر" اور "بالکنی" (کرشن چندر) گرم کوٹ، دانہ و دوام (بیدی) ٹوبہ ٹیک سنگھ، نیا قانون (منٹو) کلیاں اور کانٹے ،انارکلی اور بھول بھلیاں (اختر اورینوی) لحاف (عصمت) چائے کی پیالی، حرامجادی (حسن عسکری) آپا، ماتھے کا تلِ (ممتاز مفتی) آنندی (غلام عبّاس) طلوع و غروب، محدّب شیشے (احمد ندیم قاسمی) الاؤ، دو مزدور (سہیل عظیم آبادی) ڈاچی (اوپندر ناتھ اشک) اور کنگ پوش (دیوندر ستیار تھی) [2] یہ سارے افسانے منظر عام پر آچکے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ افسانے نئی

---

[1] "ویرانے ۔ایک مطالعہ" عابد سہیل مطبوعہ آج کل، دہلی مارچ ۱۹۸۳ء

[2] احتشام حسین کے افسانے۔احمد یوسف (آہنگ)

تکنیک سے آراستہ تھے اور ان میں افسانویت کی گہری چھاپ تھی اس کے علاوہ "میں افسانے کیوں لکھتا ہوں" (یوسف حسن)، "میرے پسندیدہ افسانے" (مقالہ - حسن عسکری) اور ساقی کا افسانہ نمبر اور نقوش کے متعدد افسانہ نمبر شائع ہو چکے تھے۔ اسی لئے احتشام حسین لکھتے ہیں :

"جب اچھّے اچھّے افسانے پڑھنے کو ملتے ہو ں تو کم اچھّے افسانے لکھنے کی کیا ضرورت ہے ۔یہی وجہ ہے کہ میں نے زیادہ افسانے نہیں لکھے ہیں۔ میرا زیادہ وقت تنقیدی مضامین میں لگ جاتا ہے اسی لئے افسانہ لکھنے کے لئے جس سکون اور دماغی تازگی کی ضرورت ہے وہ کم میّسر آتی ہے تا ہم جب کبھی میرے پاس کوئی بات لکھنے کے لئے ہوتی ہے اور وہ سوا افسانہ کے کسی اور شکل میں نہیں لکھی جا سکتی تو میں افسانہ لکھتا ہوں ۔" [1]

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام حسین کو اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ انہیں یہ احساس تھا کہ ان کے افسانے فن کی اس بلندی تک نہیں پہنچتے جہاں اس دور کے دیگر افسانہ نگار پہنچ چکے ہیں ۔اس خیال کی تائید یونس اگاسکر [2] اور احمد یوسف [3] نے بھی اپنے اپنے مضمون میں کی ہے۔ احتشام صاحب

---

[1] عکس اور آئینہ۔ احتشام حسین

[2] روشن دماغ افسانہ نگار۔ شاہ کار، وارانسی احتشام حسین نمبر

[3] احتشام حسین کے افسانے۔ آہنگ گیا، احتشام حسین نمبر

کا بیان پڑھ کر دو باتوں کا احساس ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ وہ اپنی کہانیوں کا تجزیہ کرنے میں کچھ زیادی انکساری سے کام لیتے ہیں۔ وہ ان پر اظہار خیال کرتے وقت اپنے جذبات کو الگ نہیں رکھ سکے۔ اس لئے اُن کو ان میں کوئی خوبی نظر نہیں آئی۔ دوسری بات یہ کہ احتشام صاحب صحیح معنوں میں منکسر المزاج انسان تھے۔ اپنی تعریف، اپنے ذکر اور اپنے کسی خوبی کے بیان سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ جب عام زندگی میں انھوں نے اسے پسند نہیں کیا تو اپنی افسانہ نگاری کے تجزیے میں وہ کیونکر یہ لکھ سکتے تھے کہ ان کے افسانے بھی اس عہد کے افسانوں کی تاریخ کا ایک حصہّ ہیں۔ افسانے کے عام ناقدوں نے بھی ان کی افسانے پر تنقید کرتے وقت اس پہلو کو نظر انداز کر دیا اور ان کے منکسرانہ بیان کو تنقیدی تجزیہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ ڈاکٹر اخلاق اثر کی مندرجہ ذیل رائے ملاحظہ کیجئے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ احتشام صاحب کی افسانہ نگاری کے تجزیے میں ان کی اپنی رائے کس طرح رُکاوٹ بنی ہے:

" احتشام صاحب نے اردو افسانہ کے ساتھ پورا خلوص برتا ۔انھوں نے جب یہ محسوس کیا کہ اس سے بہتر افسانے لکھے جارہے ھیں تو انھوں نے افسانہ لکھنے سے زیادہ پڑھنا مناسب سمجھا ....احتشام صاحب کو اپنے نظریات بہت عزیز تھے، انھوں نے اپنی پوری زندگی اپنے نظریات کو سونپ دی ۔" [1]

اس سلسلے میں مشہور افسانہ نگار عابد سہیل کی رائے کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئیے:۔

---

[1] احتشام حسین اور فن افسانہ فروغ اردو، لکھنؤ احتشام حسین نمبر

" احتشام صاحب کو زبان و بیان پرجو قدرت حاصل تھی اور جس کا اظہار 'ویرانے ' کے افسانوں میں جگہ بہ جگہ ہوا ہے، اس کے پیش نظر ان کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی کہ وہ پریم چند کے طرز کے افسانے (کفن، پوس کی ایک رات ' سے قطع نظر) لکھتے۔ خوبصورت منظرنامے تیار کرتے اور افسانوی ادب میں کم سے کم وہ مقام حاصل کرلیتے جو سدرشن اور اعظم کریوی کو حاصل ہوا۔ شاید اس سے بھی زائد حاصل کرلینا ان کے لئے کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔" [1]

عابد سہیل کے اس متوازن تجزیے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام صاحب کے یہاں ایک اچھے افسانہ نگار کی صلاحیتیں بہر حال موجود تھیں۔ لیکن اپنی تنقید نگاری کو اوّلیت دینے کی وجہ سے وہ اس صلاحیت سے پوری طرح کام نہیں لے سکے۔ احتشام صاحب کے افسانے اپنے عہد، اپنے ماحول اور زمانے کے اچھے افسانے ہیں۔ ان کے موضوعات دلچسپ اور اہم ہیں، ان کے افسانوں میں کردار نگاری اچھی ہے۔ اور وہ موضوع کا TREATMENT بہت خوبی سے کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے اپنی اس تخلیقی صلاحیت کا بھرپور استعمال کیا ہوتا اور افسانہ نگاری کو اپنی شناخت کا ذریعہ بنایا ہوتا تو آج بلاشبہ انھیں ہم اردو کے اہم افسانہ نگاروں کی صف میں جگہ دیتے۔

---

[1] ویرانے ۔ ایک مطالعہ آج کل، دہلی مارچ ۱۹۷۳ء

باب سوم
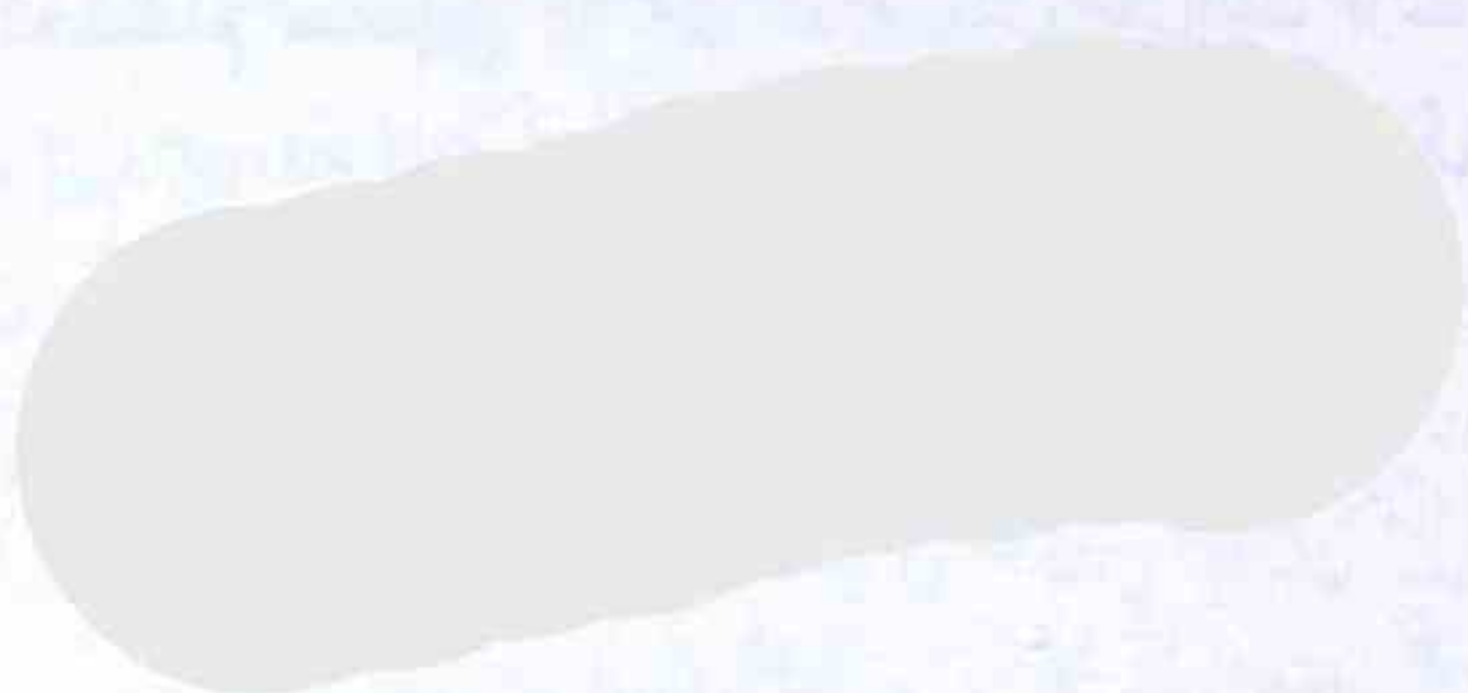
شاعری

احتشام حسین کی تخلیقی کاوشوں میں جہاں ایک طرف افسانے ہیں وہیں دوسری طرف شاعری بھی ملتی ہے۔ ان کی شعری کاوشوں کے نقوش "روشنی کے دریچے" کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ درست ہے کہ احتشام حسین کی شہرت اور بلندی کا سبب اُن کے عالمانہ تنقیدی مضامین ہیں، وہ اردو تنقید کی مملکت پر کم و بیش تیس سال تک حکومت کرتے رہے، اُن کی شخصیت پُر کشش اور باوقار تھی جس نے انہیں عوام کے درمیان مقبول بنایا۔ اُن کی شخصیت کی دردمندی اور پُر مغز مقالات سے اہلِ ادب اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی کاوشوں کے دوسرے پہلوؤں پر کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

احتشام حسین کی شعری تخلیقات اپنے اندر جمالیاتی حظ اور غور و فکر کا خاصا سامان رکھتی ہیں۔ ان کی شاعری میں رومان بھی ہے، غمِ حیات کا کرب بھی اور استحصال کے خلاف آواز بھی نیز زندگی اور کائنات کا بالیدہ شعور بھی ہے۔ احتشام حسین نے شاعری پر نسبتہً کم توجہ دی۔ اگر وہ یکسوئی کے ساتھ شعر کہتے تو بحیثیت شاعر بھی ملک گیر شہرت کے حامل ہوتے۔

احتشام حسین نے جس گھر اور جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہاں شعر و شاعری کا کوئی خاص چرچا نہیں تھا البتہ ان کے چچا شاعر تھے اور قرب و جوار میں مشہور بھی تھے۔ احتشام حسین پر ان کا اثر پڑا اور انہوں نے زمانہء طالب علمی سے ہی اشعار کہنے شروع کر دیئے۔ دستورِ زمانہ کے مطابق انہوں نے شاعری کی ابتداء غزلوں سے کی، بعد میں چند رومانی نظمیں بھی لکھیں۔ احتشام حسین کا آغاز میں تخلّص حیراں تھا اور وطن ماہل کی مناسبت سے ماہلی لکھتے تھے اسی زمانے میں انہوں نے ایک غزل کہی تھی جس کا ایک مصرعہ ہے

حیراں کو تم نے اور بھی حیراں بنا دیا [1]

احتشام حسین نے ۱۹۲۸ء میں سب سے پہلے مرزا احسان احمد (اعظم گڑھ) کے دولت کدہ پر مشاعرہ میں شرکت کی اور اپنا کلام سُنایا۔ یہیں سے وہ بحیثیت شاعر منظر عام پر آئے۔ اس مشاعرے کے شریک شعرا میں اصغر گونڈوی، اقبال سہیل اعظمی اور جگر مراد آبادی بھی تھے۔ مصرعہ طرح تھا "جلووں کے اژدہام نے حیراں کیا مجھے۔" اپنی شاعری کی ابتدا کے سلسلہ میں احتشام حسین تحریر کرتے ہیں:-

"یہ ۲۹-۱۹۲۸ء کی بات ھے جب میں اعظم گڑھ (یوپی) میں آٹھویں نویں درجہ کا طالب علم تھا۔ شعرو شاعری سے معمولی دلچسپی تو اس سے پھلے ھی پیدا ھو چکی تھی کیونکہ گھر پر اس کا

---

[1] احتشام حسین کی شاعری ۔ محمود الحسن ۔ فروغ اردو لکھنؤ، احتشام حسین نمبر

چرچا تھا۔ لیکن اعظم گڑھ کے دورانِ قیام میں
کچھ ایسے ساتھی ملے جن کی صحبت میں اس
پر جِلا ہوئی ۔ میرے خاص ساتھیوں میں سیّد
فرید جعفری تھے جو اس وقت پاکستان میں
ممتاز زندگی بسر کررھے تھے ۔ان کے والد سیّد
نجم الدین جعفری ان ھی دنوں ڈپٹی کلکٹر کی
حیثیت سے تبدیل ھو کر اعظم گڑھ آئے تھے
چونکہ ڈاکٹر جعفری ادبی ذوق کے مالک تھے......
ھم لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ادبی بحثوں اور
دلچسپیوں میں حصّہ لے کر ھمّت افزائی کرتے
تھے...... اپنی کم آمیزی کے باوجود ادبی وشعری
محفلوں میں شریک ھونے کے مواقع نکال لیا
کرتا تھا اور بڑی خاموشی سے انددر ھی اندر
محسوس کرتاتھا کہ اگر ان سے دلچسپی نہ لوں
تو صرف تعلیم ھی نھیں بلکہ زندگی بھی
ادھوری رھے گی۔" [1]

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ احتشام حُسین نے ایام طالب علمی سے ہی شعر و شاعری سے دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ اس کی شہادت ڈاکٹر سیّد اعجاز حُسین ان الفاظ کے ساتھ دیتے ہیں:-

---

[1] احتشام حسین فروغ اردو لکھنؤ صفحہ نمبر ۲۹۹

"لڑکوں میں بیت بازی خاصہ کی چیز ہوگئی تھی۔ ہر فرد اپنی سی کوشش کرتا کہ وہ زیادہ سے زیادہ موقع کے اشعار یاد کرے اور وقتِ ضرورت پیش کرے۔ بعض ایسے بھی لڑکے تھے جو شعری مطالبات کی کمی پوری کرنے کے لئے خود بھی شعر کہنے لگے۔ ایسے ہی لڑکوں میں احتشام حُسین بھی تھے۔ ان کو بھی شعر گنگنانے اور شعرکہنے اور یاد رکھنے کا ملکہ ہوگیا۔" [1]

ان حوالوں سے یہ نتیجہ واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ احتشام صاحب کی ذہنی وابستگی اور ذاتی دلچسپی شعر و شاعری سے شروع سے ہی رہی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کا میلان طبع شاعری سے زیادہ نثر کی طرف تھا۔ ان کے کلام کی اشاعت کی تاریخ پر اگر ہم نظر ڈالیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ بیچ بیچ میں وہ ایک طویل وقفہ کے لئے اس میدان سے غائب بھی ہوگئے ہیں۔

"روشنی کے دریچے" احتشام حُسین کا واحد شعری مجموعہ ہے جسے جعفری عسکری نے اتر پردیش اردو اکاڈمی کی مالی معاونت سے ۱۹۷۳ء میں احتشام اکاڈمی ا۔ نوراللہ روڈ الہ آباد یوپی سے شائع کیا۔ اس مجموعے کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصّے کا نام "وجدان" ہے جس میں ۱۹۳۳ء سے ۱۹۷۱ء تک کی غزلیں شامل ہیں۔ نظموں

---

[1] ذہن و کردار کی ابتدائی نشوونما، شاہکار و ارانسی احتشام حسین نمبر صفحہ نمبر ۷۹

کے لئے ''شوقِ فضول'' کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ ۱۹۶۵ء کے بعد سے بعض شعری رجحانات سے متاثر ہو کر انہوں نے ا۔ح۔ نورازل کے نام سے بڑی تعداد میں نظمیں کہیں جن میں سے بعض رسائل میں بھی شائع ہوئیں۔ اس حصّہ کو خود احتشام حُسین نے ''آوازیں'' کا نام دیا تھا۔ جعفری عسکری صاحب نے بھی اس حصّہ کا نام ''آوازیں'' ہی رہنے دیا۔

ابتدائی صفحات میں احتشام حُسین کے بارہ قطعات درج ہیں جن میں جوانی کی ترنگ، جوش وولولے، شباب وحُسن کی باتیں، شراب و ساقی سے ملاقاتیں، محبوب کا درد، شوخ نگہ کی داستان طرازی اور شوخ پری رو کے نظارے کو پیش کیا گیا ہے۔ ان قطعات میں ان کے والہانہ پن اور جذبۂ کیف و مستی کا پتہ چلتا ہے مگر احتشام حُسین کو جیسے جیسے تپتی زمینوں کا احساس ہوتا ہے، وہ سنگلاخ علاقوں پر نظریں دوڑاتے ہیں، وقت کے ریگستانوں پر ننگے پاؤں چلنے کا سماں دیکھتے ہیں، مزدورں کی زبوں حالی، غریبوں کی فاقہ کشی، طاقت وروں کی بالادستی اوران کے مظالم کا نظارہ وغیرہ کرتے ہیں تو ان کے شعری رویّہ، ان کے سوچنے کے ڈھنگ اور ان کی فکر میں تبدیلی آتی چلی جاتی ہے۔ اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک کا زور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بڑھنے لگتا ہے۔ لکھنؤ، الٰہ آباد، رانچی اور پٹنہ اس کے اہم مرکز بن جاتے ہیں۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ احتشام حُسین کا تعلق لکھنؤ اور الٰہ آباد دونوں سے تھا اس لئے ترقی پسند تحریک کے بانیوں سجّاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر عبدالعلیم سے وہ اچھی طرح واقف تھے نیز

ڈاکٹر رشید جہاں، علی سردار جعفری اور محمود الظفر سے بھی قریبی تعلق رکھتے تھے۔ اس تحریک کا نقطہء نظر اور انسان دوستی کا رویّہ انہیں پسند آیا اور دھیرے دھیرے احتشام حُسین بھی ترقی پسند تحریک کی ایک اہم کڑی بن گئے۔

ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے ان کی زندگی کے نقطہء نظر کو متاثر کیا۔ وہ احتشام حُسین جو اپنے قطعات میں ایک رومانی اور جذباتی شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے تھے ان کے یہاں ترقی پسند تحریک کے بعد وہ جذباتی اور رومانی انداز نظر نہیں آتا۔ ان کی بعد کی شاعری زندگی کے حادثات اور اِرد گرد کے حالات کی شاعری ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ قطعات اور ابتدائی غزلوں میں احتشام حُسین کے یہاں ان کا انفرادی غم اور انفرادی خوشی نظر آتی ہے لیکن بعد میں وہ غم زندگی کے کرب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے غم کی بات کم کرتے ہیں، عوام کی زندگی اور اس کے کَرب کی بات زیادہ کرتے ہیں۔

غزلوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ احتشام حُسین کے تجربوں میں خلوص اور صداقت کی جھلک واضح طور پر موجود ہے۔ ان کا لب ولہجہ مترنّم ہے جس میں گھلاوٹ اور نرمی کی کیفیت ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے کلاسیکی نظم و ضبط اور رچاؤ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں نئے طرز کی پیکر طرازی کا عمل ملتا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ترکِ وفا کو سوچ کے گھبرا رہا ہے دِل
اپنا خیال ہے کہ تمہارا خیال ہے

زہر کا گھونٹ بن گئی تھی شراب
ہائے اس دن وہ اجتناب تِرا

وہ تِری نیم نگاہی وہ لبوں کی جُنبِش
میری ہستی کے وہ ہر تار کا لرزاں ہونا

کوئی بتلائے محبت میں یہ کیا ہوتا ہے
ان کے ملنے پہ مرا اور پریشاں ہونا

جنوں کا دور ہے تم بھی ہو چاندنی بھی ہے
بہت دنوں پہ پھر ایسی حسین رات ملی

جب نہ سلجھی حیات کی گتّھی
ہم لگے زلفِ یار سلجھانے

یُوں شفق پُھولی ہے مشرق کے اُفق پر اے دوست
دن کا خوں رات کی چوکھٹ پہ بہا ہو جیسے

یُوں گزرتا ہے تِری یاد کی وادی میں خیال
خارزاروں میں کوئی برہنہ پا ہو جیسے

اور ہو لینے دے کچھ خون تمناؤں کا
مجھ سے مَت پوچھ مرے شوق کی روداد ابھی

احتشام صاحب کے ان اشعار میں احساس کی شدّت، سوزِ دروں کی تپش، دھیمی آنچ پر سلگتے جذبات، داخلی کشمکش، قلبی واردات و کیفیات کی متحرک تصویروں کے نقوش بکھرے ملتے ہیں۔ وہ الفاظ کو لطافت و نزاکت، اور بر محل استعمال کے نگینوں سے آراستہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

احتشام صاحب کے ان اشعار کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حُسن کی دیوی چاندنی رات میں وہ کبھی کُھلے آسمان کی طرف اور کبھی دُور بہت دُور آنے والی اس سڑک پر نگاہیں مرکوز کرتی ہے جس سے ہو کر اس کا محبوب آئے گا۔ غزل اپنے اسی داخلی کیف و مستی کے اظہار کے لئے مشہور و مقبول ہے۔ احتشام صاحب کے بہت سارے اشعار تغزل کے اس بانکپن میں ڈوبے ملتے ہیں۔

احتشام حُسین اس سلیقہ سے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں کہ وہ نازک اور سجل بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی غزلوں میں گیت کا رس جاگ اُٹھتا ہے اور تارِ نفس جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار۔

شبِ غم سہی سہی یاد اُن کی
اندھیرے میں دیا سا جل رہا ہے

کل تو خیر اُن کی یاد آئی تھی
آج کیوں ہے فضا اُداس اُداس

احتشام صاحب کے یہاں حسیّت، جذبہ کا گداز اور لطیف

کسک سب کچھ ملتی ہے اسی لئے بہت سارے اشعار بلاواسطہ احساسات کے تاروں کو چھوتے ہیں مگر احتشام صاحب فن سے زیادہ مقصد کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ان کی غزلوں کی کشش ماند پڑ جاتی ہے۔ یہ احساس ہمیں احتشام حُسین کی بعد کی شاعری میں ملتا ہے ۔مگر ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ احتشام حُسین اس رجحان کو اپنانے میں بھی ایک حد تک محتاط نظر آتے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

دراز ہیں تری زلفیں یہ مانتا ہوں میں
دراز اس سے بھی کارِ جہاں نظر آیا

وقت کے شور میں یوں چیخ رہے ہیں لمحے
بہتے پانی میں کوئی ڈوب رہا ہو جیسے

ہزار بار کفن سر سے باندھ کر نکلے
ہزار بار تری راہ میں حیات ملی
روشن نہ سہی صبح وطن اے دلِ پُر شوق
بے رونقیٔ شام غریباں تو نہیں ہے

احتشام حسین کی غزلوں میں تشکیک بھی جا بجا ملی ہے اور اس سے ان کی فکر اور سوچ کی سمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

نہ ملی کسی کو اب تک رہِ کفر و دیں میں منزل
جو سزا ہے گمرہی کی وہ یقیں کی جزا ہے

عقل پہنچی جو روایات کے کاشانے تک
ایک ہی رسم ملی کعبہ سے بُت خانے تک

احتشام حسین کی نظم گوئی کو ہم پانچ حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا حصّہ ان کی رومانی نظموں کا ہے جو ان کی ابتدائی دور کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں اُبلتی ہوئی رومانی کیفیت اور عشقیہ جذبات کی شدّت شروع سے آخر تک موجود ہے اور اُن سے پُر جوش مگر درد مند دِل رکھنے والے نوجوانوں کے احساسات اور تصوّرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس قبیل کی نظموں میں محبّت کی بازگشت، فریبِ تصوّر، یادگار فراق ......'ر' ...... خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں مجروح تمناؤں کا اظہار' فراق کے لمحات، محبوب کی بے اعتنائی، نگہ التفات کے دھوکے وغیرہ کو شعری سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔ "یادگارِ فراق 'ر' ......" میں احتشام صاحب التفات کے لمحات اور پھر ان لمحات کی یادوں کی کسک کی تصویریں اُبھارتے ہیں۔ دو بند ملاحظہ کریں ۔

تیرے چھُٹنے کا سماں اِس وقت ہے پیشِ نظر
دیکھ کر وہ خوف رسوائی سے ہر سو دیکھ کر

میرا دامن تھام کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
دیکھنا اور مُسکرا کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"

مُسکراتی جا رہی ہے چشم بھی نمناک ہے
اُف مری صبحِ مسرّت کا بھی دامن چاک ہے
التجا کی یہ ادا بھی کس قدر سفّاک ہے
اشک بھر کے سَر جُھکا کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"

یہ نظم ۱۹۳۴ء میں لکھی گئی تھی اور اس عہد میں اس طرح کی رومانی نظمیں لکھ کر بیشتر شاعر لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر رہے تھے۔ احتشام صاحب بھی اسی راہ کے مسافر دکھائی دیتے ہیں لیکن اُن کی رومانی نظموں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی نوجوان طالب علم اپنے اِظہار کے لئے کسی پیرائے کا متلاشی ہو۔ چند بند ملاحظہ ہوں ۔

شب کی خلوت میں جب تم آتے ہو
دِل کی دُنیا میں مسکراتے ہو
مُسکرا کر مجھے رُلاتے ہو
میری ہستی مٹائے جاتے ہو
یاد کیوں اِس قدر تُم آتے ہو

کسی پہلو مجھے قرار نہیں
تم پر کچھ مجھ کو اختیار نہیں

اُف مرا بخت ساز گار نہیں
اور تصوّر کا اعتبار نہیں
یاد کیوں اِس قدر تم آتے ہو

(نظم "قریبِ تصور")

بیمارِ محبت ترا پھر ہوش میں آیا
کچھ دیر بھی دلگیر نے آرام نہ پایا
تیری نگہِ شوخ نے پھر کھینچ بُلایا
ناکام محبت تجھے پھر دیکھ رہا ہے

پہلے کی طرح عشق کا مجبور بنادے
مانگے جو دُعا جینے کی مرنے کی سزا دے
جی بھر کے تجھے دیکھ لے بس اتنی رضا دے
ناکامِ محبّت تجھے پھر دیکھ رہا ہے

(محبت کی بازگشت)

ان نظموں کے بعد احتشام حسین کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جب ان کی شاعری زندگی کی دھوپ میں کھڑی زمین و آسمان کو غور سے دیکھتی نظر آتی ہے۔ اب غمِ جاناں میں غمِ دوراں بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ذاتی اور نجی محرومی میں ملک اور عوام کا غم بھی شامل ہو جاتا ہے۔ غلامی اور استحصال کے خلاف نئی جھنکار کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس نوع کی نظموں میں "تعمیرِ حیات" "یہ نظامِ کہنہ" اور "بیماری کی خبر" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اگرچہ ان نظموں کی ہیئت میں کسی طرح

کی تبدیلی یا نئے پن کا احساس نہیں ہوتا مگر فکری اور معنوی اعتبار سے ایک تازگی سی نظر آتی ہے۔ چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں ؎

ہم نشیں کھٹکی تو ہوگی تجھ کو بھی یہ ایک بات
کب سے گھیرے ہے نظام کہنہ کی تاریک رات
ملک پر غیروں کا ڈیرہ ختم ہوتا ہی نہیں
کیا قیامت ہے اندھیر ختم ہوتا ہی نہیں
طاقت پرواز ہے اور آشیاں پر قید ہے
حوصلے بیدار ہیں لیکن زباں پر قید ہے
وقت کی آواز ہے ہم کو اُبھرنا چاہئیے
اس تضاد زندگی کو ختم کرنا چاہئیے
جس نے روکا ہے ترقی سے یہی زنجیر ہے
اس نظام کہنہ کی تخریب بھی تعمیر ہے

(یہ نظام کہنہ)

اس درد کی ماری دنیا میں ایسے انساں کیوں بستے ہیں
جو ساری عمر ضرورت کی چیزوں کے لئے بھی ترستے ہیں
ہم جنگ کریں گے فطرت سے فطرت پہ قابو پائیں گے
اور فطرت پہ قابو پاکر ہم اک روز امر بن جائیں گے

(بیزاری کی خبر)

ریا پرستوں سے ایمان و دین چھینیں گے
کسی سے زر تو کسی سے زمین چھینیں گے

قدم پہ فاقہ کشوں کے گرا کے تاج اک دن
غریب رہنے کا دِل سے یقین چھینیں گے
جہاں خیال ہے آزاد جسم و جاں آزاد
لگی ہے ایسے جہاں کی اُمید اے ساقی

(تعمیر حیات)

ان نمونوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام حُسین کے اندر بیٹھا شاعر اچانک ایک قائد بن جاتا ہے اور پھر ایک مبلغ اُبھرتا ہے۔ قائد اس پر مقررانہ شان کا مظاہرہ کرتا ہے۔ سماج کا نقشہ پیش کرتا ہے اور زمانہ کی قسمت بدل دینے کے حوصلوں کا اظہار کرتا ہے اور پُر جوش نعرے بھی لگاتا ہے۔ غریبوں کی بے بسی اور بے کسی، مظلوموں کی چیخ و پکار، فاقہ کشوں کی پستی کو دیکھ کر بے چین ہو جانا اور ان کے سدّباب کے لئے آوازیں بلند کرنا احتشام صاحب کے عہد میں ترقی پسند شاعروں کا عام مزاج تھا اور پھر اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا لیکن جو گھن گرج اور بلند آہنگی سردار، مخدوم، کیفی، نیاز حیدر وغیرہ کے یہاں ملتی ہے وہ ہمیں احتشام حسین کے یہاں نہیں ملتی۔

احتشام صاحب حالات سے مایوس نہیں ہوتے، دشواریوں اور مایوسیوں کا شکار نہیں ہوتے، وہ جدوجہد کے قائل ہیں۔ انہیں اس بات پر یقین ہے کہ انہیں کامیابی ملے گی، اُن کا عزم مکمل ہوگا، اُن کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگا۔ اسی لئے وہ حالات سے مایوس ہو کر جھکتے نہیں ہیں بلکہ مردانہ وار اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔

احتشام حسین کے اس دور میں کچھ ایسی بھی نظمیں مل جاتی ہیں جن میں عشق اور ذاتی غمِ کے سائے ملتے ہیں مگر فکر کی آنچ اور لب و لہجے کی متانت کی وجہ سے اُن میں ایک سنجید گی اور ٹھہراؤ کا احساس ہو تا ہے۔ جیسے "ایک یاد گار رات" "کل آج اور کل" "روشنی لاؤں کہاں سے" مثالیں ملاحظہ ہوں۔

آج بھی تم کو کیا وہ رات ہے یاد
دل پہ جو نقش ہے وہ بات ہے یاد
مست و سر خوش مری جوانی تھی
ہر گھڑی عُمر کی سہانی تھی
رُوح کو ایسی شادمانی تھی
خود محبت سے بد گمانی تھی

(ایک یاد گار رات)

کل جس کو طاقِ دل میں جلایا تھا شوق نے
خود مجھ کو وہ چراغ بجھانا پڑا ہے آج
کل نقش جو بنائے تھے مل کر بصد نشاط
کس بے بسی سے اُن کو مٹانا پڑا ہے آج
کل روشنی تھی آج اندھیرے کا دور ہے
لیکن جیوں گا میں بھی ابھی کل اک اور ہے
چاہتا ہوں کہ غم و یاس کی باتیں نہ کروں

آؤ اس طرح کروں میں کہ نہ سُن پائے کوئی
یوں صنم توڑدوں ظلمت کے کہ اب حشر تلک
روشنی کے لئے محتاج نہ رہ جائے کوئی
(روشنی لاؤں کہاں سے)

ان نظموں کے بعد احتشام صاحب کی شاعری کچھ اور واضح رُخ اختیار کرتی ہے۔ جب زندگی اور کائنات کے لئے جو کچھ وہ صحیح سمجھتے ہیں انہیں بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کرتے ہیں تو اعتماد کا خلوص ان نظموں کی توانائی بن جاتا ہے۔ "عزم کوہکنی" اور "دوبارہ کافی ہاؤس کے کھلنے پر" اس نوع کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ خارجی ہیئت کے اعتبار سے ان نظموں میں کوئی نیاپن یا تبدیلی نظر نہیں آتی لیکن ان کا اعتماد و یقین اور ان کی رجائیت ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو ؎

ہم عہد نو کے مسافر ہیں رک نہیں سکتے
ہو رات ختم کہاں تک یہ انتظار کریں
نجوم و شمس و قمر دیکھتے ہی رہ جائیں
جبینِ ارض کو اس طرح نور بار کریں
زمیں سے عشق ہے، انساں سے پیار کرتے ہیں
متاعِ شوق انہیں پر نثار کرتے ہیں (عزم کوہکنی)

احتشام صاحب کے آخری زمانے کی نظمیں ہئیت، اظہار اور شعور تینوں میدان میں انقلاب کا عَلَم لئے کھڑی نظر آتی ہیں۔ یہ نظمیں سماجی شعور اور کائنات کے شعور کے اظہار میں رمز و کنایہ اور اشارہ و تمثیل سے زیادہ کام لیتی ہیں۔ ان میں ایک ابہام کی کیفیت بھی ملتی ہے جو ان نظموں کو معنوی گہرائی بخش کر تہہ دار بناتی ہے۔ ان نظموں میں اپنے عہد کا غم ضرور ہے اور فضا بھی کسی قدر حُزنیہ ہے مگر مجموعی طور پر ان کی مرکزی اور بنیادی کیفیت حیات بخش ہے۔ ان میں انسانوں کے بہتر مستقبل کی اُمید ملتی ہے۔ ان نظموں میں مواد اور ہئیت کا بڑا متناسب امتزاج ملتا ہے۔ ایسی نظموں میں "ملکۂ شب" "نقطہ"، "زرد رنگ، سرخ رنگ"، "تخلیق"، "وہم" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اُن میں سے بعض نظمیں اردو شاعری کے نمائندہ انتخاب میں جگہ پا سکتی ہیں۔ احتشام صاحب کی ان نظموں میں فن اور فکر دونوں اعتبار سے ایک ارتقائی کیفیت ملتی ہے اُن کو ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی ہے۔ وہ کبھی ایک مقام پر ٹھہرے نہیں ان کی متذکرہ نظمیں رواں دواں ہیں اسی لئے ان میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے۔ اُن کے آخری دور کی یہ شاعری گویا حسیّہ تصویروں کی زبان بن گئی ہے۔

سفرنامہ

احتشام حسین کے تخلیقی کارناموں میں افسانے اور شاعری کے ساتھ سفر نامہ بھی شامل ہے۔ احتشام حسین نے ۱۹۵۲ء میں راک فیلر فیلوشپ کے سلسلے میں یورپ و امریکہ کا سفر کیا تھا جس کے مشاہدات اور تجربات ''ساحل اور سمندر'' کے نام سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئے۔ وہ ایک اور سفر نامہ بھی لکھنا چاہتے تھے جو اُن کے سفر روس سے متعلق تھا لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ انہوں نے سفر روس سے متعلق جو نوٹس تحریر کئے تھے وہ ''سویت یونین...... تاثرات اور تجزیئے'' کے نام سے شائع ہو گئے ہیں۔

اُردو میں سفر نامہ کی روایت قدیم ہے۔ یہ نثر کی وہ صنف ہے جسے کہانی یا ڈائری کی شکل میں قلم بند کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک سرگذشت ہے جس میں فکشن کا رویّہ اور ڈائری کے اطوار شانہ سے شانہ ملا کر سفر کرتے ہیں۔ اس کے اندر کسی عہد، کسی قوم اور اس کی تہذیب یا ملک کے جغرافیائی، اقتصادی، اور سماجی احوال و کوائف کے نقوش ملتے ہیں۔ اس کی نثر دلچسپ اور معلومات افزا ہوتی ہے۔ ایک طرف سفر نامہ جہاں تخلیقی ادب کا لُطف دیتا ہے وہیں دوسری طرف معلومات کے دریا بھی بہاتا ہے۔ ہم بیٹھے بیٹھے بند کمرے میں بھی نادیدہ دنیا کے طول و عرض کو سفر ناموں کے صفحات پر دیکھ لیتے ہیں۔ ان کے

محض مطالعہ سے بھی نئے افکار، نئی تہذیب اور دُنیا کے نئے گوشوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔

سفر نامہ میں سیّاح اپنے سفر کے نشیب و فراز تحریر کرتا ہے۔ سفر نامہ ناول اور افسانے سے مختلف ہے مگر ڈائری یا روزنامچے سے بہت قریب ہے۔ ایک سیّاح جب سفر پر نکلتا ہے تو نِت نئے واقعات، تجربات اور مشاہدات کو قلم بند کرتا چلا جاتا ہے۔ بعد میں ان الگ الگ ٹکڑوں کو مناسب ترتیب اور پیش کش کے حُسن سے آراستہ کرتا ہے۔ ایک سفر نامہ نگار اپنے سفر نامے میں، سیاسی، سماجی اور تمدّنی حالات کے علاوہ ادبی، اخلاقی، اقتصادی اور تہذیبی زندگی کے مختلف گوشوں کی تصویریں محفوظ کرلیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب کوئی فنکار کسی تخلیق کو جنم دیتا ہے تو لاشعوری طور پر اس کے اپنے جذبات اور احساسات اس کی تحریر کے بین السطور میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ فنکار صرف اپنی ڈائری کی تزئین و تہذیب کر کے سفر نامہ کی شکل اُسے نہیں دیتا بلکہ وہ تخلیقی رویّہ سے بھی کام لیتا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے سفر نامے کی پیش کش میں بھی نِت نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ انگریزی میں اُسے سفر کو بیان کرنے والی متحرّک تصاویر یا مصوّر تقریر بتایا گیا ہے۔ A MOTION PICTURE OR ILLUSTRATED LECTURE DESCRIBING TRAVELS.[1]

اور دوسری طرف ساخت کے متعلق درج ذیل اظہار خیال ہے:۔

"TRAVELOGUES IS A SORT OF CULTURE HISTORY

1, THE RANDOM HOUSE DICTIONARY OF ENGLISH LANGUAGE, EDITION 1972, PAGE 1398

WRITTEN IN THE FORM OF FICTION OR DIARY."

سفر عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں مسافت طے کرنا۔ اس طرح سفر نامہ کا مطلب ہوا کہ سفر سے متعلق، سفر کے بارے میں اور سفر کے تجربات اور مشاہدات کے سلسلے میں باتیں کرنا۔ سفر نامہ میں صرف قصے، کہانیوں کا بیان، واقعات، تجربے اور مشاہدے کی پیش کش نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ سفر نامہ نگار کے ذہن ودِل کی کیفیات کا بھی عکاس ہوتا ہے، اس کے اندر جغرافیائی اور معاشرتی معلومات کا بھی سلسلہ پایا جاتا ہے۔ سیاح جب کسی نئے علاقے کے سفر پر نکلتا ہے تو طرح طرح کے حالات سے وہ دوچار ہوتا ہے اُسے مختلف مسائل، اُلجھنوں اور مشکلوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اگر مسرّت کے لمحات سے سرشار ہوتا ہے تو کبھی موت کے دروازہ پر پہنچ کر بھی واپس آتا ہے سیاح اُن میں سے بیشتر باتوں کو احاطہ تحریر میں لاتا ہے۔

سفر نامہ کی ہئیت اور ساخت کے بارے میں کوئی طے شدہ ضابطہ نہیں ہے۔ مختلف ادباء نے اس سلسلہ میں مختلف رائے کا اظہار کیا ہے۔

"...... سفرنامہ میں جس قسم کی اطلاعیں لازمی اور ضروری ہیں یعنی ملك کی اجمالی حالت، انتظام کا طریقۂ کار، عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیت، عمارتوں کے نقشے۔ ان میں سے ایك چیز بھی سفرنامہ نہیں ہے، البتّہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق معتدبہ واقعات ہیں اگرچہ وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ نہیں ہیں جس قدر ہونے چاہئیں۔" [1]

---

[1] سفر نامہ روم و مصر وشام ۔ مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۲

مولانا شبلی نعمانی کے درج بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سفر نامہ میں کسی بھی ملک کی عدلیہ ،انتظامیہ ، تجارت ، عمارت ، معاشرت کا تفصیلی ذکر ہونا چاہیئے۔ ہر سیاح ان سارے نکات پر تفصیل سے روشنی ڈالنا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ وہ اپنی دلچسپیوں کے مطابق ہی جلوؤں کو سمیٹتا ہے۔ ادیب عموماً تاجرانہ ذہن نہیں رکھتا اور تاجرانہ ذِہن رکھنے والے ماہر انجنیئروں کی طرح عمارتوں کے سلسلے میں اپنی رائے پیش نہیں کر سکتا مگر ہر سیّاح کی یہ کوشش ضرور ہوتی کہ اس کا سفر نامہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کی فراہم کردہ معلومات سے استفادہ کیا جائے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سفر نامہ کی پیشکش میں دلچسپی اور نت نئی معلومات ناگزیر ہیں۔

سفر نامہ کی روایت عربی، انگریزی، سنسکرت اور فارسی میں بہت قدیم ہے۔ محقّقین نے HERODOTUS کو پہلا سفر نامہ نگار تسلیم کیا ہے۔ ہندوستان آنے والا پہلا سیاح میگستھنیز ہے جو سلیوکس کے سفیر کی حیثیت سے موریہ سلطنت کے عہد میں ہندوستان آیا۔ مشہور چینی سیاح فاہیان ہندوستان آنے والا دوسرا سیاح تھا جو پانچویں صدی عیسوی میں میگستھنیز کے تقریباً سو سال بعد بودھ مذہب کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا، اس کے دو سو برس بعد یون سانگ ہندوستان آیا اور اس کے بعد تو عرب سے کئی سیّاح آئے۔ ابو ریحان البیرونی ان میں سے ایک اہم سیّاح ہے جس نے بڑے تصویری انداز میں سفر کے واقعات کو قلم بند کیا ہے۔

چودہویں صدی عیسوی میں ابن بطوطہ ہندوستان آیا جس نے

یہاں کے تہذیبی حالات کو بڑے دلکش پیرائے میں قلم بند کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس وقت کے ہندوستان کے معاشرتی اور تہذیبی حالات معلوم ہوتے ہیں۔

اُردو میں سفر نامے کی روایت دوسری اصناف کے مقابلہ میں خاصی پرانی ہے۔ محققین ادب نے ''مثنوی نادر'' کو اُردو کا پہلا سفر نامہ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ ایک منظوم سفر نامہ ہے جو اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی نے اپنی کتاب ''تین مسافر'' اور ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے ''اُردو سفر نامے انیسویں صدی میں'' میں کسی قدر تفصیل سے اس سفر نامے کا ذکر کیا ہے۔ نواب اعظم جاہ والی ارکاٹ نے مدراس سے ناگور شریف کا سفر کیا تھا جس کے احوال نادر نے منظوم شکل میں پیش کئے ہیں۔ مثنوی کے آخری چند اشعار سے سفر اور سفر نامے کی تصنیف کی تاریخ بر آمد ہوتی ہے۔ جو ۱۸۲۸ء، ۱۸۳۲ء ہے۔ اب تک چونکہ اس سے پہلے کا کوئی سفر نامہ دستیاب نہیں ہے اس لئے نادر کا سفر نامہ ہی سب سے قدیم ٹھہرا۔

یوسف خاں کمبل پوش نے ۳۸-۱۹۳۷ء میں کلکتہ سے انگلستان تک کا سفر کیا اور ''عجائبات فرنگ'' کے نام سے اپنا سفر نامہ پیش کیا جو ۱۸۴۷ء اور ۱۸۷۳ء میں بالترتیب پہلی اور دوسری بار شائع ہوا ہے۔ پہلے اُسے اُردو کا پہلا سفر نامہ قرار دیا جاتا تھا مگر ''مثنوی نادر'' کی تحقیق کے بعد یہ اُردو کا دوسرا سفر نامہ کہا جائے گا۔ ''عجائبات فرنگ'' میں انگلستان کی سائنسی، معاشرتی اور تہذیبی جھلک پائی جاتی ہے۔

یوسف خاں کمبل پوش کا سفر نامہ اپنے بیان کی دلکشی اور مشاہدے کی گہرائی کی وجہ سے بھی اہم ہے۔ سر سیّد کا سفر نامہ "مسافران لندن" ان کے اقوام مغرب کے مطالعہ اور دنیاوی فلاح کے وسیلہ کی تلاش اور اس میں سر گرداں حال مسافر کا بیان ملتا ہے۔ سر سیّد نے ۱۸۶۹ء میں لندن کا سفر کیا تھا۔ اس وقت قوم مسلم کی ایک بڑی ذمہ داری اُن کے سر تھی۔ شبلی ۱۸۹۲ء میں بیروت اور بیت المقدس کے کتب خانوں سے استفادہ کرنے وہاں پہنچے اور واپسی پر اپنا "سفرنامہ روم و مصر و شام" تحریر کیا۔ محمد آزاد ۱۸۶۵ء میں وسط ایشیا اور ۱۸۸۵ء میں ایران پہنچے۔ آزاد کا دوسرا سفر نامہ ایک علمی سفر نامہ تھا جسے انہوں نے "سیر ایران" کے نام سے تحریر کیا۔ اُسی طرح نثار علی بیگ کا سفر نامہ "سیر یورپ" نواب حامد علی خاں کا سفر نامہ "سیر حامدی" اور بھوپال کی شاہجہاں بیگم کا "سفر نامہ حرمین" بھی اہم ہیں۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ سفر میں آسانیاں ہوتی چلی گئیں۔ آمد و رفت کے ذرائع آسان تر ہوتے چلے گئے اور تیز رفتار سواریوں پر سفر کرنے سے جہاں وقت کی بچت ہوئی وہاں بہت حد تک مصائب اور مشکلات میں کمی آگئی۔ لوگ دوسرے ممالک کا سفر تجارت، تعلیم اور علاج کے سلسلہ میں بھی کرنے لگے ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ سمینار، کانفرنس اور معلومات حاصل کرنے کی غرض سے بھی جانے لگے ہیں۔ منشی محبوب عالم مدیر "پیسہ اخبار" لاہور ۱۹۵۵ء میں پیرس میں عالمی نمائش دیکھنے گئے۔ انہوں نے فرانس، انگلینڈ، روم،، مصر اور شام کی بھی سیاحت کی اور "سفر نامہ ءیورپ"

کے نام سے اپنے مشاہدات جمع کیئے۔ "سفر نامہ یورپ" میں زبان کا حُسن، روانی اور دلکشی بڑی پُرکشش ہے۔ منشی صاحب نے "سفر نامہ بغداد" بھی لکھا مگر وہ اتنی شہرت حاصل نہ کر سکا۔ اسی طرح محمد علی قصوری کا سفر نامہ "مشاہدات کابل و داغستان"، سلطان جہاں بیگم کا سفر نامہ "سیاحت سلطانی"، شیخ عبدالقادر کا سفر نامہ "مقامِ خلافت" نواب فتح علی خاں قزلباش کا سفر نامہ "نقشِ فرنگ"، سیّد ابو ظفر ندوی کا سفر نامہ "برہما نواب (۱۹۲۱ء)، بیگم حسرت کا "سفر نامۂ عراق" (۱۹۳۰ء)، سیّد سلیمان ندوی کا سفر نامہ "سیرِ افغانستان" (۱۹۳۳) اور قاضی ولی محمد کا "سفر نامہء اندلس" (۱۹۲۴ء) اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے اہمیت کے حامل ہیں۔

بیرونی ممالک کو بہ نظر مطالعہ و مشاہدہ دیکھنے کا رواج ابتدائے زمانہ سے رہا ہے۔ ہر سیّاح نئی معلومات حاصل کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ سفر کرنے اور واپسی پر سفر نامہ تحریر کرنے کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی سے ہوتا ہے۔ یوں تو عجائبات فرنگ، مسافران لندن، سفر نامہ روم و مصر و شام، سیر یورپ وغیرہ انیسویں صدی میں تحریر کیئے گئے ہیں۔ مگر سفر نامہ کو باقاعدہ فن کی طرح برتنے کا عمل بیسویں صدی میں ملتا ہے۔ قاضی عبدالغفار کا سفر نامہ "نقش فرنگ" اپنی رومانی نثر کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے تو بیگم حسرت موہانی کا "سفر نامہء عراق" نسوانی دلچسپی کے مظاہر پیش کرتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے ۱۹۳۸ء میں ساڑھے پانچ ماہ کے عرصہ میں سترہ ممالک کا سفر کیا اور نتیجہ میں "مسافر کی ڈائری" منظر عام پر آیا۔ آغا محمد اشرف کے یہاں دوسرے

ممالک میں کچھ ڈھونڈنے کے عمل میں شدّت پائی جاتی ہے۔ ان کی دو کتابیں "لندن سے آداب عرض" اور "دلیش سے باہر" فنّی اعتبار سے اہم کتابیں ہیں۔ محمود نظامی کا سفر نامہ "نظر نامہ" اور اختر ریاض الدین کا سفر نامہ "سات سمندر پار" اور "دھنک پر قدم" دل نشیں انداز میں تحریر کیے گئے سفر نامے ہیں۔

وقت کا دھارا بڑھتا ہے، پھیلتا ہے، راستے بناتا ہے۔ نیا عمل، نئی ترکیب، نئے مزاج کو اپنے اندر پیوست کرتا ہے۔ ایک تجربے کے بعد دوسرا تجربہ اور پھر تجربات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ سفر نامے بہر حال وقتاً فوقتاً ہی لکھے جاتے رہے ہیں لیکن احتشام حُسین کے سفر نامے "ساحل اور سمندر" کے بعد تو سفر نامہ لکھنے کی ایک روایت پڑتی دکھائی دیتی ہے۔

جمیل الدین عالیؔ نے "تماشہ مرے آگے" اور "دنیا مرے آگے" لکھ کر ادب کے کلاسیکی پس منظر کو زندگی کے موجود مناظر سے مربوط کیا۔ ابن انشاء اپنے مخصوص اسلوب اور مزاحیہ نثر کی وجہ سے اُردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ "دنیا گول ہے" ، "چلتے ہو تو چین کو چلیئے" اور "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" ابن انشاء کی خوش نظری اور خوش اسلوبی کے نمونے ہیں۔ قرۃ العین حیدر بحیثیت فکشن رائٹر بے انتہا مشہور و مقبول ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں اور خاص طور سے اپنے ناولوں میں نئے رجحان، نئے رویّے اور منفرد تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ ان کا سفر نامہ "جہان دیگر" بھی کافی اہم ہے۔ سیّد محمد عقیل

کا سفر نامہ "لندن اولندن"، ثریا حسین کا "پیرس نامہ"، کرنل محمد خاں کا "بسلامت روی" قابلِ توجہ سفر نامے ہیں۔ اسی طرح آل احمد سرور کا سفر نامہ "میں نے امریکہ کو کیسا پایا" ان کے مخصوص اسلوب اور انداز کا غماز ہے۔ خواجہ حسن نظامی، رام لعل، جگن ناتھ آزاد، بلراج کومل، سنتوش کمار، رفعت سروش، مجتبیٰ حسین، احسن فاروقی کے سفر نامے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

درج بالا سفر ناموں کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے مگر اُردو کے بعض ادیب ایسے بھی ہیں جنھوں نے دوسرے ممالک کے سفر میں ادب اور ادیب پر ہی زیادہ توجہ دی۔ خارجی واقعات، حادثات، مناظر، مشاہدات کے علاوہ ان کے داخلی جذبات بھی ان کے سفر ناموں میں ملتے ہیں۔ عام طور پر وہ وہاں کے ادبی رجحان، رویّوں اور تحریکوں کا مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ایسے سفر ناموں میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا سفر نامہ "دید و باز دید"، صہبا لکھنوی کا سفر نامہ "میرے خوابوں کی سرزمین" انتظار حسین کا سفر نامہ "زمین اور فلک اور دیکھے"، ممتاز مفتی کا سفر نامہ "ہند یاترا"، "جوگندر پال کا سفر نامہ "پاکستان یاترا" "ڈاکٹر عبادت بریلوی کا سفر نامہ "ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک" ان کے علمی ذوق و شوق اور ادبی خزینوں کی بازیافت ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے سفر نامے میں ہندوستان کے ادباء و شعراء اور مصنفین کا تفصیلی ذکر "ایک طویل ملاقات" میں کرتے ہیں۔ اسی طرح حسن رضوی "دیکھا ہندوستان" میں مشاعروں، شاعروں اور ادیبوں کا ذکر دلچسپ پیرائے میں کرتے

ہیں جس سے ہندوستان کی ادبی و تہذیبی زندگی پر روشنی پڑتی ہے ساتھ ہی ایک پاکستانی مسافر، شاعر اور صحافی ہندوستان کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اس کا بھی اظہار ہے۔

احتشام حُسین کا سفر نامہ ''ساحل اور سمندر'' بھی اُردو سفر ناموں کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر سیّد احتشام حُسین ۱۹۵۲ء میں راک فیلر فاؤنڈیشن کی طرف سے امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک کے سفر پر گئے تھے پر دس ماہ کے دورئے. امریکہ وانگلستان کے احوال اور تاثرات انہوں نے اپنے مخصوص نثری اسلوب میں لکھے ہیں۔ جس کے ابواب یہ ہیں: ایک گذارش، کشمکش اور سمجھوتہ، فکریں، سفر کے اٹھارہ دن، نئی دنیا، پرانی دنیا کی طرف اور سخن ہائے گفتنی احتشام حُسین نے امریکہ کے قیام کے دوران جو کچھ دیکھا، سُنا، محسوس کیا انہیں ''ساحل اور سمندر'' جیسے معنی خیز عنوان کے تحت ترتیب دیا ہے جو اُردو سفر ناموں میں ایک اضافہ ہے۔ انہوں نے وہاں کی تہذیب، ثقافت، ماحول، علم، ذہنی کیفیات، سماجی شعور کا گہرا مطالعہ کیا۔ امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام اور حکمراں طبقہ کی عائد کردہ پابندیاں، جنسی جرائم اور جنسی گمراہی، امریکی سماج کا نشّہ دولت و ثروت، اُن کی اُلجھنیں اور کشمکش، من مانی پالیسیاں، روس اور روسی حکمرانوں کی مخالفت وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے ان مشاہدات اور تجربات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔

احتشام حُسین اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ ایسی تحریر پیش

کررہے ہیں جو باعث افتخار ہے۔اس لئے انکساری سے کام لیتے ہیں:۔

"ساحل اور سمندر" امریکہ اور انگلستان کے سفر سے متعلق چند بے ربط تاثرات اور خیالات کا مجموعہ ہے اوراس کو اسی نظر سے پڑھنا چاہیئے ۔خود مجھے اس کی خامیوں کا احساس ہے تاہم اسے پیش کرتے ہوئے اس بات کی خوشی بھی ہے کہ اس کا تعلق ادب کی اس صنف سے ہے جس کی اُردو زبان میں کمی ہے۔" [1]

احتشام حسین نے امریکہ کے علاوہ فرانس اور انگلینڈ کا بھی سفر کیا۔اس عرصۂ سفر پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

" تقریباً دس مہینے اور لگ بھگ چالیس ہزار میل دیکھنے اور سمجھنے ، کھونے اور حاصل کرنے کے لئے نہ مدّت کم ہے نہ سفر چھوٹا ہے۔" [2]

احتشام حسین پہلے باب میں سفر کی دعوت ملنے اور فیصلہ کرنے اوراس سلسلہ میں مختلف ذہنی کشمکش سے گذرنے کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔وہ بار بار اپنے کام کی نوعیت کے متعلق بھی سوچتے ہیں جبکہ

---

[1] ساحل اور سمندر (دوسری اشاعت) نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۸۴ء صفحہ ۷

[2] ساحل اور سمندر (دوسری اشاعت) نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۸۴ء صفحہ ۳۴۷

مسٹر گل پیٹرک، راک فیلر فاؤنڈیشن کے نمائندے سے ان کی اس موضوع پر بات چیت ہو چکی تھی۔ مسٹر گل پیٹرک نے کہا تھا:-

"آپ امریکہ اور انگلستان میں لوگوں سے مل کر یہ اندازہ لگائیے کہ ہندوستان میں ادبی زندگی میں نظم پیدا کرنے، اچھے ہونہار ادیبوں کی عزّت افزائی کرنے اور کتابوں کی اشاعت کو بہتر بنانے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔" [1]

یہ باتیں احتشام صاحب کے مزاج کے موافق تھیں۔ وہ سامراجی اور سرمایہ داری کے اصولوں پر مبنی طاقتوں کو انسانیت کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ایسی طاقتوں کی سیاست اور معاشی امداد پس ماندہ اور ترقی پزیر ملکوں کو محکوم بنانے پر مجبور کرتی ہے۔ امریکہ ایک ایسے ہی سرمایہ دارانہ اور حلقۂ اثر بڑھانے والے جنگجو ملک کی حیثیت سے سامنے تھا۔ ۱۹۳۵ء کے بعد ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا اثر رہا اور احتشام حُسین اس کے قائدین اور مبلغین میں سے ایک تھے اب اسی سرمایہ دار ملک کی جانب سے انہیں دعوت دی گئی تھی اس لئے ان کا فکر مند ہونا لازمی تھا۔ ۵۲-۱۹۵۰ء کے آس پاس یہ عام رویّہ تھا کہ امریکہ کی مفید کتابیں بھی پڑھنے سے قبل ہی مردود قرار دی جاتی تھیں اور امریکہ و امریکی ادب کے لئے دِل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ ان ہی نکات پر غور کرتے ہوئے احتشام حُسین لکھتے ہیں:-

---

[1] ساحل اور سمندر (دوسری اشاعت) نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۸۴ء صفحہ ۱۲

" بعض اوقات بڑے اوچھے خیالات بھی پیدا
ہوتے تھے ۔ اب تک تو ترقی پسندوں کے بعض
انتہا پسندانہ خیالات پر ، روس کی زندگی اور
سیاست پر، ھندوستان کی کمیونسٹ پارٹی پر
جب جی چاھتا تھا اعتراض کردیتا تھا اور لوگ
اسے خلوص پر مبنی سمجھتے تھے لیکن امریکہ
سے واپس آکر جب کبھی ایسی ھی باتیں پُر
خلوص طور پر بھی کھوں گا تو اوچھی
طبیعت رکھنے والے یھی سمجھیں گے کہ
محض امریکہ کی حمایت میں کہ رھاھوں ۔
بعض لوگ مذاق ھی مذاق میں اس کی طرف
اشارہ بھی کرجاتے ھیں۔ کیا کرنا چاھئیے ؟
کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ [1]

ان ساری باتوں کو سوچ کر احتشام صاحب کشمکش میں مبتلا تھے۔ دوسری مگر اہم بات یہ بھی تھی کہ وہ افراد خانہ سے بے حد جُڑے ہوئے تھے اور انہیں یہ خیال ستا رہا تھا کہ ان کی عدم موجودگی میں ان کے گھر والوں کو تکلیف ہو گی ۔ پھر بھی کافی غور و خوض اور رائے مشورے کے بعد وہ ذہنی طور پر امریکہ کے سفر کے لئے تیار ہو گئے۔

دوسرے باب "فکریں" میں یونیورسٹی سے چھٹی لینے اور لوگوں سے رخصت ہونے تک کی باتوں کو انہوں نے تحریری شکل

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۱۶

دی ہے۔ احتشام صاحب کو پاسپورٹ حاصل کرنے میں بہت دشواریاں پیش آئیں۔ اپنے وطن ماہل (اعظم گڑھ) سے رخصت ہونے نیز پنچایت و باشندگان ماہل کی محبتوں اور خلوص کے نقوش وغیرہ کو انھوں نے جذباتی انداز میں پیش کیا ہے۔ احتشام صاحب کے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیہ میں برہمن اور ہریجن، ہندو اور مسلمان چھوٹے اور بڑے سبھی شامل تھے۔ بقول احتشام حُسین:-

"یہ محبت مجھ پر قرض رہے گی! مجھے یونیورسٹی کی کُرسی راک فیلر فاؤنڈیشن سے ملا ہوا اعزاز، رسالوں میں چَھپی ہوئی تعریفیں سب اس بے پناہ اور پُر خلوص محبت کے سامنے ہیچ معلوم ہورہی تھیں۔" [1]

تیسرا باب "سفر کے اٹھارہ دن" کے عنوان سے درج ہے۔ اس باب میں احتشام صاحب لکھنؤ سے دہلی، دہلی سے مدراس اور مدراس سے بمبئ اور پھر بمبئ سے بذریعہ طیارہ نیویارک تک پہنچنے کی داستان رقم کرتے ہیں۔ احتشام حُسین لکھنؤ سے دہلی ویزا اور دوسرے کام کے لئے جاتے ہیں۔ پہلے یہ طے پاتا ہے کہ ان کا سفر امریکہ بحری راستے سے ہوگا اس لئے وہ مدراس جاتے ہیں۔ مدراس پہنچنے پر یہ طے پاتا ہے کہ ان کا سفر بذریعہ ہوائی جہاز ہوگا اس لئے وہ مدراس سے بمبئ آتے ہیں۔ پروگرام کے اس ردّوبدل سے انہیں کوفت ہوتی ہے اور وہ

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۳۱

کافی اُلجھن محسوس کرتے ہیں پھر بھی اپنی ڈائری میں راستے کی دشواریوں، سیر و تفریح، احباب کی محبتوں، سفر کی صعوبتوں اور اپنی دلچسپیوں کے اظہار میں ان کا قلم بے جھجھک (الفاظ) سجاتا چلا جاتا ہے۔

مدراس پہنچ کر احتشام حُسین وہاں کے مختلف مقامات کا نظارہ کرتے ہیں۔ ادیبوں فنکاروں سے ملتے ہیں اور میرینا بیچ کی وسعت جو انہیں زندگی کی عظمت کا احساس دلاتی ہے، اُس کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں:-

"شام کو خاص طور سے میرینا بیچ دیکھنے گیا۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے ساحلوں میں اس کا دوسرا نمبر ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اس وسیع ساحل پر زندگی کی بے پایاں عظمت کا احساس ہوتا ہے......... پانی کی لہریں گزوں اونچی اٹھتی اور چڑھ جاتی ہیں پھر پلک جھپکتے میں واپس ہو جاتی ہیں ۔ چھوٹے بچّے عورتیں اور نوجوان ہی نہیں بوڑھے لوگ بالکل کنارے پر کھڑے ہوجاتے ہیں ، لہریں انہیں گھُٹنوں تک بھگوتی اور واپس ہوجاتی ہیں...... شام کی ٹھنڈی اور دُھلی ہوئی ہوا محض سمندر کے پانی کی خوشبو لئے ہوئے آتی ہے ۔ اندھیرے کے ساتھ سمندر کی ہیُبت اور سیاھی بڑھتی جاتی ہے......مدراس کا ساحلی حُسن بالکل فطری ہے۔ " [1]

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ نمبر ۵۰

میرینا پیچ کی احتشام حسین ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ اُس کا حُسن ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ مدراس کے بعد احتشام حُسین کے قدم جب بمبئی کی سرزمین پر پڑتے ہیں تو اپنے محسوسات اس طرح پیش کرتے ہیں:-

"بمبئی ہندوستان کا بہت ھی کاسما پالیٹن شہر ھے ...... چھ سات منزلہ عمارتیں، لاکھوں کی تعداد میں موٹریں، بسیں، کروڑوں کا مال رکھنے والی دکانیں ...... یہاں زندگی عمل کا نام ھے۔ یہ اور بات ھے کہ دولت کی اس فراوانی کے باوجود یہاں لاکھوں انسان بھوکے ،ننگے، بے گھر ھیں۔ پڑھے لکھے بیکار اور کام کے شائق بیمار بنے بیٹھے ھیں۔اس شہر میں تہذیب کی وہ ساری برکتیں اور لعنتیں اکٹھا ھیں جو دنیا کے کسی بڑے شہر میں پائی جاسکتی ھیں۔" [1]

باب چہارم میں احتشام حُسین قیامِ امریکہ اور ہندوستان واپسی تک کی داستان کو تقریباً دوسو صفحے میں بیان کرتے ہیں۔ وہ امریکہ کی تہذیب و تمدن، دانشوران سے گفتگو، طلباء کے رجحانات، عوام کا رویّہ، سیاسی صورت حال ، امریکہ کے مستقبل، تفریحی مقامات،

---

[1] ساحل اور سمندر

سائنسی ایجادات ، لائبریریوں میں جمع مخطوطات و نوادرات، مجسّمے ، یونیورسیٹیاں ، اخبارات کے رویّے ور رجحانات، طعام و مشروبات اور اکیڈمک سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

احتشام صاحب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ جس مقام کو بھی دیکھتے ہیں، جن اشخاص سے ملاقاتیں کرتے ہیں اس کا ذکر بہت تفصیل سے کرتے ہیں۔ احتشام صاحب کی دور رس نگاہیں جب ماضی و مستقبل سے بحثیں کرتی ہیں تو ایک دانشور احتشام حُسین سامنے نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو :

" یہاں کے کسی مشہور نقّاد نے میرے ذھن کے کسی گوشے کو منوّر نہیں کیا ۔ ایلیٹ ، رچرڈس ، ولسن، بروک، ٹرلنگ یہ یہاں کے اہم ترین نقّاد ھیں۔ جن میں سے کچھ کو پہلے پڑھ چکا ھوں۔ مجھے یہ اندازہ نہیں ھوتا کہ یہ لوگ ادب اور زندگی کے تعلق سے اس قدر چِڑھتے کیوں ھیں، کھتے ھیں کہ زندگی الگ ھے اور ادبی یا شعری تجربہ الگ، پھر قیامت یہ ھے کہ تجربہ کی ھمہ گیری اور شدّت پر بھی زور دیتے ھیں اور دبی زبان سے ایک اخلاقی مطمح نظر بھی تسلیم کرتے ھیں۔ یہ لوگ ایک خاص قسم کے جذباتی غیر مادّی تجربہ کے اظھار کو شاعری کھتے ھیں اور جیسے ھی مذھب کے علاوہ

زندگی کی کسی ایسی قدر کا ذکر آجاتا ھے جو انسانی تجربہ کا جزو ھے، یہ لوگ اُلجھ جاتے ھیں۔ ولسنؔ اور ٹرلنگ کو ان لوگوں سے الگ کیا جاسکتا ھے۔ رچرڈس کی راہ بھی دوسری ھے لیکن نفسیاتی انداز نظر نے انھیں بھی وھیں پھنچا دیا ھے ۔ یھاں کے زیادہ تر نقّاد کسی نہ کسی شکل میں ایلیٹ اور پاؤنڈ کے روحانی شاگرد ھیں جو عقیدہ ...... اور صرف کیتھولک عقیدہ رکھنے والوں ھی کے یھاں نظم اور حُسن کو دیکھتے ھیں۔" [1]

احتشام حُسین بنیادی طور پر ترقی پسند تھے۔ انہوں نے اختر حُسین رائے پوری اور دیگر کاروان تحریک کی طرح ادب اور زندگی کے رشتے کو اٹوٹ مانا۔ اس وقت امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں ادب کا مطالعہ خاص ادبی نظریئے سے کیا جارہا تھا۔ وہ لوگ مارکسؔ، لیننؔ، اینگلز کے نقطہء نظر سے متاثر نہیں تھے۔ ان کی فکر اور کاوش کو غیر دانشورانہ بتاتے تھے۔ امریکہ اور یورپ کے مصنفین کی نظر میں ادب برائے ادب کا فلسفہ قابلِ قدر اور لائق تحسین تھا۔ بہر حال احتشام صاحب کا یہ نظریاتی اختلاف درمیان میں حائل تھا۔ اسی لئے جب بھی وہ امریکہ کے دانشوران و مصنفین کی زبانی اور اخباروں میں اشتراکی تنظیم اور اس کے قائدین کے خلاف باتیں سُنتے یا پڑھتے تو تڑپ اٹھتے۔ ان کی

---

[1] ساحل اور سمندر احتشام حسین نمبر صفحہ ۱۸۳

تڑپ، کسک اور بے چینی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

" صبح کے اخباروں میں اسٹالین کی خطرناک بیماری کی خبر نے رنجیدہ کردیا ۔ اس خبر سے متعلق یہاں کے اخبارات کی سُرخیوں اور ان کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی شیطانی مسرّت کو کبھی نہ بھولوں گا۔ " [1]

" یہاں کے اخبارات، ان کی سُرخیاں، ان میں شائع شدہ مضامین، ان کے اندر چُھپی ہوئی انسان دشمنی سے مملو خواهشیں دیکھ دیکھ کر تکلیف ہو رہی ہے لیکن پڑھتا بھی ہوں۔ " [2]

احتشام حُسین انسان دوست تھے اور سرمایہ دارانہ نظام کے سخت مخالف مگر امریکہ کا ماحول احتشام صاحب کے مزاج کے عین مخالف تھا اسی لئے احتشام صاحب کو تکلیف پہنچنی لازمی تھی ترقی پسندوں پر جب بھی ضرب لگتی ہے، احتشام حُسین بے چین ہو جاتے ہیں:-

" یہاں چند آسانیوں کے باوجود ترقی پسندوں کی راہ بڑی دشوار گزار ہے ، سر مایہ دار پریس کسی شکل میں ان کے کارناموں کا ذکرھی

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۲۵۷

[2] ساحل اور سمندر صفحہ ۲۶۰

نھیں کرتا۔ نہ یونیورسیٹیوں کے پروفیسر، نہ اخباروں کے تبصرہ نگار ان کا نام لیتے ھیں، جُملے نقل نھیں کرتے بلکہ ایك سرپرستانہ انداز میں انھیں گمراہ کھہ کر یا ہزارھا دفعہ کے دھرائے ہوئے الزامات لگا کر آگے بڑھ جاتے ھیں۔ "[1]

احتشام حُسین کی یہ بے چینی اور کسک اُن کے نظریات اور فکر کی وجہ سے فطری تھی۔ انسانوں کے ذریعہ انسانوں پر ہو رہے ظلم کے وہ خلاف تھے۔ سرمایہ دارانہ ممالک کے جور و ستم کے مخالف تھے۔ سفاکانہ عمل اور جنگ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ ۳۰ مارچ ۱۹۵۳ء کی ڈائری میں یوں رقم طراز ہیں:-

"بھت دنوں سے یھی سوچتا رھاھوں کہ دنیا کے عوام کو متاثر کرنے اور سرمایہ دار ملکوں کو آزمانے کے لئے اس اقدام کی شدید ضرورت ھے۔ امن دوستوں کو وہ سب کچھ کرنا چاھئیے جس کے بعد جنگ جوئی کی خواھش کا دھبہ سرمایہ دار ملکوں کے دامن سے دھویانہ جاسکے یا پھر وہ امن کی فضا قائم رکھنے پر مجبور ھو جائیں۔ یقیناً انسان اجتماعی طور چاھے تو امن قایم ھو سکتا ھے اور دنیا جنت بن سکتی ھے۔" [2]

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۲۵۶

[2] ساحل اور سمندر صفحہ ۲۷۵

احتشام حُسین گویا گم گشتہ جنت کی تلاش میں سر گرداں تھے۔ لندن ، پیرس، نیویارک، لاس اینجلس، کیلی فورنیا، سین فرانسسکو، واشنگٹن، کیمبرج، بوسٹن اور شکاگو کی یونیورسٹیوں کا دورہ کرتے ہیں۔ وہاں کے اساتذہ، نقّاد، دانشوروں اور طلباء سے ملاقاتیں کرتے ہیں، خطبے دیتے ہیں اور تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ "ساحل اور سمندر" میں ان ملاقاتوں کا باقاعدہ ذکر ملتا ہے۔ احتشام حُسین مسائل پر غورو خوض کرتے ہیں، تبصرہ کرتے ہیں اور ان سے واضح طور پر اتفاق واختلاف کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

" کولمبیا یونیورسیٹی کے پروفیسرڈارف مین سے اصول لسانیات کے متعلق گفتگو ہوئی۔ کل ھی ڈاکٹر لطف علی صورت گر سے بھی ملا...... ادھر مجھے یھی دُھن ھے کہ ایرانی اصولِ شاعری میں یونانی اور عربی اثرات کا پتہ لگا کراس کاسلسلہ اردو میں ڈھونڈھا جائے اور پھر اس کا مقابلہ سنسکرت کے جمالیاتی فلسفہ سے کرکے کوئی نظریہ قائم کیاجائے جو تاریخی اور سماجی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے غورو فکر کے لئے بنیاد کا کام دے سکے " ...... پروفیسر کاظم گیھانی سے بھی ملا، اُن سے ایرانی تھذیب او سیاست کے متعلق باتیں بھت سی ہوئیں ...... آج ڈاکٹر برنھارڈ

گائگر سے مل کر بہت خوشی ہوئی، یہ ویانا
یونیورسیٹی کے مستشرق ھیں۔ ایران شناسی
میں خاص درجہ رکھتے ھیں۔ "[1]

ایک اور ملاقات کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

"آج میں سنسکرت کے پروفیسر موسیو برنسکاف
سے ملا۔ روسی ھیں۔ یہاں تیس سال سے رہتے
ھیں ۔ ہندوستان کی لسانی گتھی کے متعلق باتیں
ہوئیں ۔ اُن کا خیال ھے کہ ہندوستانی زبانوں
میں اس وقت سنسکرت کی جو بھرمار ہو رہی
ھے اُس سے مصنوعی زبانیں وجود میں آئیں گی۔
انگریزی کے دو پروفیسر سے ملا ۔ امریکہ میں
تنقید کے متعلق تھوڑی بہت باتیں ہوئیں۔ "[2]

احتشام صاحب لندن کی عظمت، اس کے شکوہ، اس کی تاریخی اہمیت، اس کی رنگین داستانوں، اس کے جلال و جمال کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔ وہ لندن کی سامراجیت کے تصورات کے خلاف ہیں مگر وہاں کے علمی خزانوں اور نامور مصنفین کی وجہ سے اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لندن سے متعلق اُن کے خیالات ملاحظہ ہوں:-

"اور لندن ! اس لفظ میں کتنی داستانیں، رنگین
اور خونی مرقعے ، تاریخی واقعات، شعرو ادب کے

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۶۳۔ ۲۶۲

[2] ساحل اور سمندر صفحہ ۲۲۲

خزانے پوشیدہ ھیں۔ اس لفظ سے کتنی باتیں، کتنی یادیں متعلق ھیں، اسے تو خاص نظر سے دیکھنا ھے! لندن کو ، دنیا کے سب سے بڑے شہر کو ، جس کی رونق اور گرم بازاری میں ھمارا لھو بھی صرف ھوا ھے۔ "[1]

لندن سِٹی کا نقش اُن کے قلب و ذہن پر کس طرح حاوی ہوتا ہے اس کا عکس دیکھئے:-

" کل لندن سِٹی کے علاقے میں جانے کا اتفاق ھوا۔ گذشتہ جنگ کی بھیمانہ بمباری کے نشانات کھنڈروں کی صورت میں اب بھی موجود ھیں اور بھت ھیں۔ تعمیر کا کام تیز رفتار معلوم نھیں ھوتا ، یوں تو بعض اوقات سارا شہر دھوئیں میں جھلسا ھوا اور بم زدہ معلوم ھوتا ھے لیکن اس علاقہ میں پھنچ کر اس کا زیادہ احساس ھوا۔ قریب ھی بڑے بڑے انگریزی اور غیر ملکی بینک ھیں اور کچھ دور ھٹ کر سینٹ پال کا مشہور گرجا گھر ...... مکانوں اور گلیوں کے ھجوم میں دبے ھوئے ھونے کے باوجود نمایاں۔ اندر جا کر اس کے حُسن تعمیر اور تاریخی عظمت کا احساس

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ نمبر ۲۷۴

ھوتاھے۔ گوشہ گوشہ سے تاریخ وابستہ ھے اور انگریزی شہنشاھیت کے لئے جان دینے والوں کے مجسمے اس کے نوادر میں سے ھیں۔ گنبد کا حُسن اور نقّاشی کے نمونے سرسری نگاہ سے دیکھنے والوں کو بھی متوجہ کرتے ھیں۔ اس کی تعمیر تو اٹھارھویں صدی کے ابتدائی حصّے میں نشاۃ الثانیہ کے تعمیری اصول کے مطابق کرسٹوفررن کی تھی لیکن اس کی آرائش میں ڈھائی صدیوں کے انگریزی صنّاعوں اور فنکاروں کا ھاتھ ھے۔ "[1]

لندن (انگلستان) سے ہندوستانیوں کی تلخ یادیں وابستہ ہیں۔ ہندوستانیوں کو غلام بنا کر رکھنے والے ظالم و جابر حکمراں عام طور پر اسی لندن کے باشندے تھے مگر ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ لندن زبان و ادب کا مرکز اور گہوارہ رہا ہے۔ احتشام صاحب نے لندن کے دونوں رُخ کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:-

" لندن کا حقیقی حُسن، اس کی اصل عظمت، اس کی سنجیدہ سحر کاری، اس کے ٹھہراؤ، صدیوں کی پروردہ علم و عمل کی روایات، میوزیموں ، کتب خانوں ، تھیٹروں اور علمی انجمنوں میں ھے......

---

[1] ساحل اور سمندر۔ صفحہ ۲۷۸

...... میری لندن کی پسندیدگی خالص نہیں ہے۔ ان سیاہ گھناؤ نے دھبّوں پر بھی نگاہ جاتی ہے جنھیں اس کے دامن سے دھویا نہیں جاسکتا۔ مجھے اس کی سامراجیت، قدامت پرستی، مخصوص اخلاقی تصّورات، علیحدگی پسندی، نو آبادیوں میں ظالمانہ استحصال سبھی سے نفرت ہے لیکن اپنے علمی خزانوں کی وجہ سے میں اُسے ایک اور نظر سے دیکھتا ہوں ۔ میرے لئے تو یہی بہت تھا کہ اس کی مٹّی میں شیکسپئیر ، ملٹن اور جانسن، سوئفٹ، ورڈس ورتھ، کولرج، ڈارون، مارکس اور ڈکنس آسودہ خواب ہیں۔ اس میں نیویارک کی چمک دمک ، بھاگ دوڑ اور ہماہمی نہیں ، پیرس کی لطافت و نزاکت بھی نہیں ۔ پھر بھی وہ سب کچھ ہے ایک انسان جس کی تمنّا کر سکتا ہے۔" [1]

"ساحل اور سمندر" کے مطالعہ سے یہ بات بھی اُبھر کر واضح شکل میں سامنے آتی ہے کہ احتشام حسین پر کشش نثر لکھنے میں بھی پیچھے نہیں تھے۔ وہ سفر نامہ تحریر کرتے ہیں تو الفاظ کی چاشنی، جملوں کی معنی خیزی و برجستگی اور منظر کشی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ برمحل جُملے اور الفاظ کی لطافت ان کی نثر کی خاص خوبی ہے۔ وہ چند الفاظ

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۳۶۔۳۳۵

میں تصویر بنا دینے کا فن جانتے ہیں۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:-

" کل صبح لاس اینجلس پهنچا ۔ هالی ووڈ کی وجه سے اسے ستاروں ، نظاروں ، نگاروں اور بهاروں کی دنیا بهی کهه سکتے هیں۔ " [1]

احتشام حسین ۸ / جون ۱۹۵۳ء کو لندن سے پیرس پہنچے جہاں انہوں نے یونیورسٹی اور اکیڈمی کے علاوہ لکسم برگ کا باغ بھی دیکھا۔ پیرس کی شام، اس کی حُسن دوستی اور جمالیاتی ذوق سے بھی محظوظ ہوئے۔ وہ پیئت پیلیس، گرلنڈ پیلیس، آرک واترانف، فاش اوینیو، ماولین، پیلے وندوم، سیکرے کور، ماں مارت، نیشنل لائبریری، مولیر کا مجسمہ وغیرہ کی بھی سیر کرتے ہیں اور تنقید و تبصرہ، پسند و ناپسندی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ پیرس سے متعلق ان کے خیالات ملاحظہ ہوں:-

" اب تك میں نے جو شهر دیكهے هیں ، ان میں پیرس سب سے زیادہ پسند آیا ۔ یهاں کے میوزیم ، میخانے ، عبادت گاهیں۔ تهیٹر اور اوپیرا ، رقص گاهیں ، باغ، تاریخی مقامات تعداد میں اتنے اور اس قدر متنوع هیں که ان کے دیکهنے کے لئے ایك عمر چاهئیے ۔ پیرس ایك شهر نهیں، دنیا هے۔ ایك فضا، ایك تاثر هے ۔ اس کا خاص مزاج هے اور یه سب کچه صدیوں کے انقلابات کا نتیجه هے ۔اس میں شاهوں کے جلال اور انقلابیوں کے نفسِ شعله بار

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۲۴۱

کے اثرات کی رنگ آمیزی ہے، اس کے اسٹیج پر
محض ڈرامے نہیں ہوئے ہیں، دنیا کی تقدیر بنتی
بگڑتی ہی ہے۔ اس نے صرف اشیاء کی تجارت
نہیں کی ہے بلکہ خوابوں اور خیالوں کا بیوپار
بھی کیا ہے ۔ تربیت ذوق اور فکر انگیزی میں پیرس
کا بڑا حصّہ ہے ۔ اس لئے اسے پسند نہ کرنا کفر
ہو گا لیکن کفریہ بھی تو ہے کہ کوئی فرانسیسی
زبان نہ جانے، نائٹ کلبوں میں نہ جائے ، فنکاروں
کی انجمن میں نہ بیٹھے، پیرس کی رنگ رلیوں میں
شریک نہ ہو اور چار دن کے اندر اس کی روح میں
اتر کر، اسکے اندر جھانک کراس کے راز معلوم
کرنے کی کوشش کرے! بہرحال کہنے کے لئے میں
نے پیرس دیکھ لیا۔ " [1]

احتشام حسین خلوت پسند اور خاموش طبیعت کے مالک تھے۔
ان کے مزاج میں شوروغل اور ہنگامے کا دخل نہیں تھا، وہ دنیاوی تعیش
سے کوسوں دور رہے۔ شاید اسی لئے ان تمام تفریح گاہوں اور ذوق کو
تسکین دینے اور اشتہار بڑھانے والی قوتوں کی موجودگی کے باوجود وہ
بیزاری بھی محسوس کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ان کا یہ خیال:-

" یہاں ہر طرح کی دلچسپیاں ہیں، یہاں ہر طرح
کی تفریحیں ہیں ، شہر خوبصورت اور متنوع ہے

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۳۲۱۔۳۲۰

لیکن طبیعت اُلجھ رہی ھے۔ اسی سے اندازہ ھوتا ھے
کہ اگر کسی کو راس نہ آئے تو جنت بھی تکلیف دہ
ھوسکتی ھے۔ " [1]

رنگ اور خوشبو، بہار اور شباب، کیف اور سرمستی کی طرف آدمی کا جھکاؤ فطری ہے۔ احتشام حُسین بھی امریکہ اور یورپ کی بہاروں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ان کی نبض پر انگلی رکھ کر دیکھتے ہیں، اس کی دھڑکنوں کا شمار کر کے دیکھتے ہیں تو کہہ اُٹھتے ہیں " کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی حَسین نہیں ہے۔ " لیکن احتشام حُسین چونکہ سامراج مخالف اور ترقی پسند نظریات کے حامل تھے، ایک شریف آدمی اور دردمند دل کے مالک تھے، اُن کا ایک خاص نظریۂ فکر تھا، شاید اسی لئے اُن کے نظریات اور 'عقائد' انہیں " واش آوٹ " ہونے سے بچالیتے ہیں۔ ملاحظہ ہواُن کی جذباتی تحریر:۔

" پکیڈلی کے ایک رستراں میں بیٹھ گیا اور
سوچنے لگا، کون کھتا ھے کہ زندگی حسین
نھیں ھے! یہ خوبصورت دن اور یہ حسین راتیں،
یہ پُر جلال آفتاب اور یہ چاند ستاروں کا
حسن، یہ نور و نکھت کی فراوانی اور یہ
بادلوں کی ھماھمی ، یہ گُل بیز چمن اور
پھولوں کے یہ عناں گیر تختے ، یہ نغموں کا بھتا
ھوا سیلاب اور یہ مصّوری اور مجسّمہ سازی

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۲۴۵

کے معجزے ، یہ شاندار عمارتیں اور یہ ھنستے
ھوئے بے فکر لوگ ، یہ تفریح کدے اور یہ رقص
گاھیں، یہ کتب خانے اور میوزیم ، یہ تھذیب
کی برکتوں سے مالامال زندگی ...... کون کھتا
ھے کہ زندگی حسین نھیں ھے!

یہ انسانی حُسن ، یہ جامہ زیب جسم ، یہ
گوشت اور پوست کے اندر تھرکتی ھوئی جوانی،
یہ اختلاط اور پیار کے نظارے ، یہ جرأت شکن بے
اعتنائی ، یہ رنگین ھونٹوں کے دلآویز خطوط اور
یہ آبشار کی طرح گرتی ھوئی زلفیں ، یہ جسم
کے اندر نہ سمانے والا شباب (سینہ شمشیر سے
باھر ھے دم شمشیر کا) کون کھہ سکتاھے کہ
زندگی حسین نھیں ھے۔

یہ علم و فضل کے دریا بھانے والے دانشور، یہ
قربانیاں دینے والے سیاسی کارکن ، یہ زندگی
اورسماج کے دلوں کی دھڑکن سننے والے
انسان دوست ، یہ آگے بڑھنے کے لئے جدوجھد
کرتی ھوئی انسانیت! کیا ان میں حُسن نھیں
ھے ؟ لیکن ٹھھرو ! میرے اندر کوئی اور بولنے
لگا، یہ مفلسی کاشباب اور یہ بکتے ھوئے
جسم ، یہ جوانوں کے زرد چھرے اور پھیکے

تبسّم ، یہ بھیک مانگتی نگاہیں، یہ بیمار بچّے ، یہ سرمایہ دار کے ماتھے کی شکن اور مزدور کے جسم کا پسینہ ، یہ ہونٹوں پر سوئے ہوئے سوال اور یہ اظہار حقیقت پر پابندیاں ، یہ ارمانوں کے مدفن بن جاتے سینے اور یہ دھڑکتے دلوں کی دوری ، یہ طاقت کا نشہ اور کمزور کی بے بسی ، یہ رنگ اور نسل کی خلیج اور قتل و غارت کی گرم بازاری ...... کیا میں یہ سب کچھ اس لئے سوچتا ہوں کہ افسردہ ہوجاؤں ۔" [1]

احتشام حسین راک فیلر فاؤنڈیشن کے نمائندے مسٹر گِل پیٹرک کی دعوت پر امریکہ گئے۔ اس سفر میں انہیں پچاسوں دانشوروں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے مختلف نکات اور موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا، یورپ اور امریکہ کے ادبی رویّوں اور رجحانات کا مشاہدہ کیا، زبان و بیان اور ہندوستان اور امریکہ کے ادب اور اس کی ترسیل سے متعلق باتیں کیں۔ مسٹر گِل پیٹرک پر احتشام حُسین یہ واضح کرتے ہیں کہ ہندوستانی ادب کے معاملہ میں ہندوستان کی تاریخ ، روایات، موجودہ حالات، اندرونی تضاد کو پیشِ نظر رکھ کر مطالعہ کرنا ہوگا، امریکی یہی غلطی کرتے ہیں کہ وہ امریکہ کی تعلیم، خوش حالی، ذرائع حمل و نقل

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۳۰۳۔۳۰۲

کی افراط اور مختصر سی تاریخی روایات کی روشنی میں موجودہ ہندوستان کا ذہن سمجھنا چاہتے ہیں۔[1] احتشام حُسین مختلف یونیورسٹی کی لائبریریوں کے ساتھ ساتھ مختلف انجمنوں اور مشہور لائبریریوں میں اور میوزیم میں نوادرات و مخطوطات کے مطالعہ کے لئے گئے۔ ان میں انڈیا آفس اور برٹش میوزیم اہم ہیں۔ انڈیا آفس کی بڑی، پیچیدہ اور مضبوط عمارت، کتابوں کے ڈھیر، تصویروں اور مجسموں سے احتشام حُسین کافی متاثر ہوئے:-

"اس وقت اس میں تقریباً ڈھائی لاکھ کتابیں اور اکیس ہزار مخطوطے ہیں - بیس ہزار مشرقی مخطوطوں کے علاوہ اصل ہندوستانی اور ایرانی تصاویر ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں ہیں۔ مخطوطوں میں سب سے بڑی تعداد سنسکرت کی ہے، آٹھ ہزار تین سو، اس کے بعد فارسی چار ہزار آٹھ سو، عربی تین ہزار دو سو، اُردو دو سوستّر اور ہندی ایک سو ساٹھ - ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوران کی خط و کتابت ، ضروری کاغذات، نجی روزنامچے نہ جانے کتنے ہیں۔"[2]

امریکہ کی ترقی اور حُسن سلیقہ سے احتشام صاحب متاثر بہت ہوئے۔ وہاں جو کام کرنے کا ڈھنگ اور ترتیب کا سلیقہ ہے اس سے

---

[1] ساحل اور سمندر - ص ۱۶۶

[2] ساحل اور سمندر صفحہ ۲۸۳

اتّفاق کرتے ہیں۔ امریکی ادباء ودانشور ہندوستانی عوام، مصنفین اور تحریک سے متعلق تفصیل سے اچھی باتیں کرتے ہیں۔ عزّت واخلاق سے ملتے ہیں مگر احتشام حُسین کو اِن کے لہجہ کے اندر سے جھانکتا ہوا ترحّم صاف دکھائی دیتا ہے اوران کا دِل چھلنی ہو جاتا ہے۔ پھر بھی وہ علم وادب کی فضا اور حُسن انتظام سے اس حد تک متاثر ہیں کہ ہندوستان میں اس کی مثالیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ دیکھئے ان کی سوچ کے سائے:-

" ایک اچھی علمی انجمن کی ضرورت ہے جو اکیڈمی کے سارے علمی کاموں پر نظر رکھے ۔ جیسے واشنگٹن کی امریکن کونسل آف لرنڈسوسائٹیز ۔ ہندوستان کی موجودہ زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست وغیرہ مستقل انگریزی میں شائع کرنا ، مختلف زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں کے ریویو شائع کرنے کے لئے ایک سہ ماہی انگریزی رسالہ نکالنا، ہندوستانی زبانوں کی کتابوں کے انگریزی ترجمے کرانا، اگر اتنے ہی کام شروع ہوجائیں تو ہندوستان کا سر دنیا کے سامنے اونچا اُٹھ سکتا ہے۔ یہ کام حکومتوں ،

یونیورسیٹیوں ، ادبی انجمنوں اور ادیبوں کی مدد اور منظّم کوشش ھی سے کئے جاسکتے ھیں۔ ھندوستان پھنچ کر یہ دُھن باقی رھتی ھے یا نھیں۔" [1]

احتشام حُسین کا سفرِ امریکہ و یورپ کئی جہتوں سے معنی خیز اور اہمیت کا حامل ہے انہوں نے ساحل اور سمندر کا نظارہ کیا، دانشوروں اور نقادوں سے ملاقاتیں کیں، یونیورسیٹی کی تعلیمی فضا دیکھی۔ حُسن اور حُسن تصوّر، رنگ اور آہنگ کی اُس دنیا کو بے حد قریب سے دیکھا جہاں فن مصوّری، مجسمہ سازی اور انسان کی تخلیقی قوتوں کے سر چشمے اُبل رہے تھے۔ نیشنل گیلری اور برٹش میوزیم کو وہ شوق کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ پکاسو کی بنائی ہوئی اسٹالین کی تصویر اور روداں کا مشہور سنگ مرمر کا مجسمہ "بوسہ" THE KISS کو بہ نظر غور دیکھتے ہیں۔ دوداں کے اِس کارنامے کو لاکھوں جدید فنّی کارناموں پر وہ بھاری سمجھتے ہیں مگر پکاسو کے ذریعہ بنائی گئی اسٹالین کی تصویر اُنہیں پسند نہیں آتی۔ نیشنل گیلری میں احتشام صاحب رمبراں، لیونارڈ دوانچی، رینورائے، روبنسن کی بعض تصویروں کو دیکھ کر عالمِ خیال میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ [2]

احتشام حُسین نے باب اوّل کے پہلے پیراگراف میں اپنی کیفیتِ ذہنی کے سلسلہ میں اظہار کرتے ہوئے ایک بات کہی تھی:-

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۱۷۹ ۔ ۱۷۸

[2] ساحل اور سمندر صفحہ ۲۸۹

"رنج مجھے بے حد رنجیدہ کر دیتا ہے اور خوشیاں
زیادہ خوش نہیں کرتیں۔" [1]

شاید یہی وجہ ہے کہ پورے سفر میں احتشام صاحب زندگی سے لطف حاصل کرنے اور مسرّتیں سمیٹنے میں پیش پیش نظر نہیں آتے بلکہ اکثر حیرت و حسرت کے شکار دِکھائی دیتے ہیں۔ اس پہلو کو وہ ہر لمحہ جھٹکنے اور دُور کرنے کی بھی کوشش کرتے مگر شاید ناسٹلجیا کی گرفت مضبوط تھی اس لئے وہ فرصت کے اوقات میں اپنے خاندان کے افراد کے بارے میں سوچتے، خیال کرتے اور بار بار اُن کا ذکر کرتے۔ "ساحل اور سمندر" میں اس طرح کے ذکر ضرورت سے زیادہ ملتے ہیں اگرچہ اس سلسلہ کو عام طور پر غیر ضروری اور غیر دلچسپ قرار دیا جاتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ اگر احتشام صاحب کی ذہنی کیفیت کے اس حصّے کا مطالعہ نہ کیا جائے تو احتشام حُسین کی شخصیت کو سمجھنے اور پرکھنے میں دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔

احتشام حسین اس سفر نامہ میں اُنھیں باتوں کا ذکر کرتے ہیں جن سے اُنھیں خاص دلچسپی ہے۔ وہ متعدّد اشخاص سے روزانہ ملاقات کرتے تھے اگر وہ ہر واقعہ کا بیان ضروری سمجھتے اور تفصیلی جائزہ لیتے اور تبصرے کرتے تو یہ سفر نامہ ہزاروں صفحات پر محیط ہوتا اور اس کی افادیت اور دلچسپی کا خاتمہ ہو جاتا۔

احتشام صاحب کا یہ سفر امریکہ و یورپ تقریباً دس ماہ کا رہا مگر اِحتشام صاحب اس مدّت کو مختصر اور ناکافی قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنے اس

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۹

سفر کے واقعات کے بیان میں جس اعتدال اور میانہ روی سے کام لیتے ہیں وہ ان کے جملوں سے اَخذ کیا جا سکتا ہے :

''میں نے کوشش کی ھے کہ اسے بہت سے ادبی ،فلسفیانہ یا علمی مباحث سے گراں بار نہ ھونے دوں بلکہ ایک ایسا متوازن انداز قائم رھے کہ یہ باتیں ادیبوں اور علم دوستوں کو بالکل سطحی نہ معلوم ھوں ....میں اسے تسلیم کرتا ھوں کہ صرف چندمھینوں کے قیام کے بعداجنبی ملکوں کے متعلق بہت جچی تلی رائے قائم کرنا مشکل بھی ھے اور نا مناسب بھی لیکن یہ خیال درست نھیں کہ یہ ملک بالکل اجنبی ھیں۔دور حاضر میں معلومات حاصل کرنے کے جو ذرائع موجود ھیں انھوں نے اس کام کو بہت آسان بنا دیا ھے۔ ''[1]

احتشام صاحب جب امریکہ کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو ان کے ذہن کے دریچے سے کئی طرح کے سوالات جھانک رہے تھے۔وہ کس حیثیت سے جا رہے ہیں اور انھیں کون سا کارنامہ انجام دینا ہے؟ وہ ہندوستانیوں کے حق کی باتیں کہاں تک کر سکیں گے؟ کون سنے گا ان کی باتوں کو — ؟؟اس طرح کی تشویش کا اِظہار ابتدائی صفحات میں ہی انھوں نے کیا ہے:-

---

[1] ساحل اور سمندر صفحہ ۸،۷

"میری حیثیت کیا ہے ؟ ایک طالب علم کی جواپنے علم اور تجربہ کو وسعت دینے،ایک خاموش تماشائی کی طرح دوسری تہذیبوں کا مطالعہ کرنے اور انھیں سمجھنے کی کوشش کرنے اور جس حد تک ممکن ہو انصاف پسندانہ طور پر دوسری قوموں اور لوگوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لئے جا رہا ہے ۔اُسے یہ یقین نہیں ہے کہ وہ بہت کچھ سیکھے گا، اُسے یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ بہت جچی تُلی رائے قائم کرے گا ،اسے یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ وہ امریکہ یا انگلستان میں ہندوستان کا پایہ بلند کرے گا ۔اُسے اپنے اوپر یہ بھروسہ ضرور ہے کہ جہاں تک ہو سکے گا وہ جذبات پر قابو رکھ کر انصاف پسندانہ حقائق کا مطالعہ کرے گا اور وہاں کچھ سیکھے گا تو اپنے پاس چھپا کر نہیں رکھے گا اس میں اپنے ملک کو بھی شامل کرے گا ۔" [1]

احتشام صاحب کا سفر نامہ "ساحل اور سمندر" امریکہ کے مطالعاتی دورے کا ثمر ہے۔ [2] اس سفر میں احتشام حسین روس نواز

---

1 ساحل اور سمندر صفحہ نمبر ۳۵

1 ساحل اور سمندر صفحہ نمبر ۳۶۴

اور اشتراکیت کے علمبردار ہوتے ہوئے بھی امریکہ میں کھوئے کھوئے اور متحیّر نظر آتے ہیں اور سفر نامے کو لکھتے وقت نہایت محتاط رہتے ہیں۔ واقعات کے بیان یا جہاں کہیں، وہ اپنی خواہشات اور دلچسپیوں کا اظہار کرتے ہیں وہاں بھی وہ کبھی جذبات میں نہیں بہتے اس سے ان کی ذہنی بالیدگی، فنکارانہ شعور اور حسّاس رویّے کا پتہ چلتا ہے۔ اسی لئے احتشام حسین کہتے ہیں:

”میں نے سفر کو ذہنی عیّاشی بننے نہیں دیا بلکه چیخوف کی طرح اپنے اندر کے حیوان کو سدھاتا، سدھارتا اور شائسته عمل بناتا رہا۔ ایسا سفر کانٹوں پر چلنے اور پھولوں میں بسر کرنے کا فن سکھاتا ھے۔“ [1]

احتشام حسین نے پورے سفر نامہ میں امریکہ کے سماجی نظام سے بیزاری اور سرمایہ دارانہ ماحول سے عام طور پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ وہ بہر حال ترقی پسند تھے اس لئے اس طرح کا ردّ عمل ان کے یہاں فطری ہے لیکن وہ متعصب نہیں تھے اس لئے امریکہ کی ترقی اور خوشحالی دیکھکر ایک حد تک اطمینان کی سانس بھی لیتے ہیں۔ انہیں امریکہ میں اندھیرے اُجالے کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اپنے پورے سفر کا تاثر کتاب کے آخری صفحات پر یوں اُبھارتے ہیں:-

”مجھے اس امریکه سے نفرت کیسے هو سکتی ھے جس نے میری حیرت اور علم میں اضافه کیا۔ جس نے لنکن، جفرسن، وھٹ مین، پین، مارک ٹوین، فاسٹ، جروم، پال رابسن، گولڈ، سِل سیم اور روزن برگ

---

[1] ساحل اور سمندر ص ۳۶۷

کو جنم دیا۔مجھے نفرت ہے وھاں کے حاکم طبقہ سے اس سیاست سے جو دنیا کو ہڑپ کرنا چاھتی ھے ،اُس سرمایہ دارانہ نظام سے جس کی نظر میں انسان بے حقیقت ہے۔مجھے یقین ھے کہ آج امریکہ جس ذھنی بحران، جس نفسیاتی بیماری میں مبتلا ھے ،اُس سے وہ ضرور باھر نکلے گا اور اس وقت اس کی ساری عملی صلاحیتیں زندگی کو خوشگوار اورحسین بنانے میں صرف ھوں گی کیونکہ امریکہ کے جذبۂ عمل ،لگن اور قوت تنظیم سے اس کا دشمن بھی انکار نہیں کرسکتا۔" [1]

احتشام حسین کا سفر نامہ "ساحل اور سمندر" ۳۶۷ صفحات پر محیط ہے اور دلکش نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے اور بقول ڈاکٹر اجمل اجملی:

"ساحل اور سمندر"......ناامیدیوں ،ذھنی تحفظات ، شکوك اورشبھات نیز ٹھوس تجربے سے حاصل معلومات پر محیط ھے ۔ احتشام صاحب نے اپنے یہ سارے تجربات وتاثرات بڑے خوبصورت انداز میں قلم بند کئے ھیں ۔اندازِ بیان اتنا خوبصورت ،بلیغ جامع اور پُر اثر ھے کہ ایك ایك بات دِل میں اترتی اور ذھن میں بیٹھتی چلی جاتی ھے ۔" [2]

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ "ساحل اور سمندر" احتشام حسین کے تخلیقی سفر میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے جس کے مطالعے کے بعد احتشام صاحب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

---

۱ ساحل اور سمندر صفحہ نمبر ۳۶۳

۲ سوویت یونین ۔ تاثرات اور تجزیے

ایک نا مکمل سفرنامہ

سوویت یونین - تاثرات اور تجزیے

احتشام حسین ۱۹۶۹ء میں، غالب کے صد سالہ جشن کی تقریبات میں شرکت کے لئے فرینڈ شپ سوسائٹی، اورینٹل انسٹی ٹیوٹ تاشقند کی دعوت پر سوویت یونین گئے تھے۔ اس سفر میں ان کے ساتھ ہندوستانی وفد میں ڈاکٹر عبدالعلیم، مجروح سلطان پوری، منیب الرحمٰن، مالک رام اور کیفی اعظمی صاحبان بھی شامل تھے۔

احتشام حسین اس موقع پر وسط ایشیا کے علاوہ لینن گراڈ اور ماسکو بھی گئے۔ سویت یونین کی پالیسی اور وہاں کے اشتراکی نظام سے احتشام صاحب پہلے ہی سے متاثر تھے۔ جب لکھنؤ ترقی پسندوں کا ایک اہم مرکز بنا تھا تو احتشام صاحب اس کے سرگرم کارکن تھے۔ جب ہند سوویت یونین کلچرل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تھا تو احتشام صاحب اس میں بھی سرگرم رہے تھے اسی لئے سوویت یونین میں اِحتشام صاحب کا نام ادب واحترام کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ سوویت یونین کے مشہور ہند شناس ای چیلی شلیف نے کہا تھا کہ شہر میں احتشام حسین موجود ہوں تو پہلا کام یہی ہے کہ ان سے ملا جائے۔

احتشام صاحب ۱۱ر مئی ۱۹۶۹ء کو الہ آباد سے اس سفر کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ ان کا یہ سفر ادبی، تہذیبی اور ثقافتی نقطہ ء نظر سے بے حد اہمیت کا حامل رہا۔ وہ اس سفر کے اہم نکات اپنی ڈائری میں نقش کرتے گئے۔ ان کا یہ ارادہ رہا ہوگا کہ فرصت کے اوقات میں اسے ایک سفر نامہ کی شکل دے دی جائے گی مگر افسوس اس ارادہ کو وہ پایہ تکمیل تک پہنچانے سے قبل ہی ابدی نیند سو گئے۔ احتشام صاحب نے سولہ روزہ دورے کی نوٹنگ ماسکو کے آخری دن ۲۷، مئی ۱۹۶۹ء تک کی ہے۔ احتشام صاحب کے یہ تاثرات ہم تک کن ذرائع سے پہنچے اس کی تفصیل کے لئے درج ذیل اقتباس ملاحظہ کریں:۔

”احتشام صاحب کے یہ تاثرات خام مواد کے طور پر کاغذات میں گم رہتے۔ آخر یہ طے کیا گیا کہ اسی صورت میں انہیں احتشام صاحب کے پڑھنے والوں

تك پهنچا دیاجائے کہ یہ امانت کسی فرد واحد کی نہیں بلکہ پورے ادب کی ہے چنانچہ تاثرات کے عنوان سے ان کے مندرجات حاضر خدمت ہیں۔

مُرتّب کی حیثیت سے میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ ادھورے جُملے پورے کردئیے ہیں اور یہ کوشش کی ہے کہ تاثرات میں ایك ربط پیدا ہوجائے تاکہ پڑھنے والا مجموعی تاثر قائم کرسکے۔" [1]

احتشام صاحب اپنے اس پورے سفر میں کچھ زیادہ ہی حسّاس دکھائی دیتے ہیں۔ سوویت یونین سے چونکہ انہیں جذباتی لگاؤ رہا تھا اسی لئے وہ ہر پل اپنی آنکھیں مطالعے، مشاہدے اور بیش قیمت تجربات کے لئے وا رکھتے ہیں۔ سفر کا آغاز ہوتے ہی شاید اُن کی ڈائری کے اوراق بھرنے لگتے ہیں۔ ایرپورٹ ہو یا ہوائی جہاز، اس کی رفتار ہو یا اس کی خصوصیات یا راستے کے نظارے ہر جلوہ کو وہ محفوظ کر لینا چاہتے ہیں۔ مکانات کے طرز تعمیر، مجسّمے، نقاشی کے نمونے، موسم، ادبی و تہذیبی سرگرمیاں غرض ایک نقش کے بعد دوسرا نقش اُبھرتا چلا جاتا ہے۔ احتشام صاحب نے سوویت یونین کی یونیورسٹیوں کا بھی دورہ کیا وہاں کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالر اور ان کے طریقۂ کار کو دیکھا۔ وہاں کی طرز تعلیم کا بھی سرسری ذکر ملتا ہے۔ سوویت یونین میں کھانے کے نظم، ڈرائنگ روم کی آرائش یہاں تک کہ ضروریات کی اشیاء کی قیمتوں

---

[1] سوویت یونین تاثرات اور تجزیے۔ مرتب: ڈاکٹر اجمل اجملی

کی جانکاری بھی ہمیں دیتے ہیں۔

جہاں کہیں اُن کی نظر تاریخی عمارات، مقبرہ، مسجد وغیرہ پر پڑتی ہے وہ رُکتے ہیں اور اس کی اہمیت اور نوعیت کو نوٹ کر لیتے ہیں۔ سوویت یونین میں ہندوستانی وفد کا پُر تپاک استقبال کیا گیا۔ اُن کے ساتھ وہی حسنِ برتاؤ کیا گیا جو اہم سیاسی وفد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس وفد کا دورہ محض ادبی اور ثقافتی تھا۔ احتشام صاحب وہاں کے بلند اخلاق اور نرم رویّے، کیف و سرور کے اہتمام اور رقص و موسیقی کی محفلوں کا ذکر خاص طور سے کرتے ہیں۔ اس وفد کا مختلف انجمنوں اور کلبوں کی جانب سے پُر تپاک خیر مقدم کیا گیا۔ محبت اور خلوص سے بھری دعوتوں کا ذکر بھی بار بار کرنا احتشام صاحب نہیں بھولتے۔

احتشام صاحب اس ڈائری کے اوراق میں جذبات اور تخیلاتِ محض میں ڈوبتے نہیں چلے جاتے ہیں بلکہ ان کا قلم سائنٹفک انداز سے حرکت کرتا ہے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ احتشام صاحب جب اسے کتابی شکل دیتے اور باقاعدہ سفر نامہ تحریر کرتے تب سفر نامہ نگار احتشام صاحب اُبھر کر ضرور سامنے آتے۔

اشتراکی نظام اور سوشلزم کا جب بھی وہاں ذکر آتا تو وہ محتاط رہتے مگر کبھی کبھی ایک دو جُملے نوک قلم تک آ ہی جاتے ہیں:-

" اگر کسی اور چیز کے لئے نہیں تو اس عزّت نفس کے لئے، اس سکون کے لئے، اس آسائش کے

لئے سوشلزم کی ضرورت ہے ۔ روسی حکومت اور عوام جس طرح تعمیر کے کام میں لگے ہوئے ہیں ۔ اس میں جنگ کا انہیں تصوّر بھی نہیں ہو سکتا ۔ ہاں مجبوراً جھونک دیئے جائیں تو دوسری بات ہے۔" [1]

" کیا روسیوں کو دوسروں کے مقابلے میں احساس برتری ہے ؟ مجھے یہ بھی نظر نہیں آیا۔

جو ازبکی نوجوان ہمارے سامنے ہیں اور ہر وقت ملتے رہتے ہیں وہ با اختیار معلوم ہوتے ہیں، ہر کام باقاعدگی اور اختیار سے کر لیتے ہیں۔" [2]

احتشام حُسین جب لینن کے مقبرہ پر جاتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے اُن کا رواں رواں لینن کے احترام میں موؤب کھڑا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

" کریملن کی مشرقی دیواروں کے پاس لینن کا مقبرہ، ہر روز قطاریں کئی کئی گھنٹوں کے بعد سامنے سے گزرتی ہیں۔ ہر روز یہی منظر ۔ بارش ہو ، گرمی ہو، بر ف پڑ رہی ہو ہم لوگ بھی تھوڑی سی رعایت لے کر کیو میں آگے کھڑے کئے گئے ، دودو کی قطار، اگر سیدھی کھڑی ہو تو

---

[1] سوویت یونین تاثرات اور تجزیے۔ مرتبہ ڈاکٹر اجمل اجملی صفحہ ۳۱

[2] سوویت یونین تاثرات اور تجزیے۔ مرتبہ ڈاکٹر اجمل اجملی صفحہ ۷۰

میلوں لمبی، پچیس جگہ سے بل کھاتی ہوئی قطار آهسته آهسته لال چوک کے میدان میں لینن مولیم کی طرف بڑھتی ھے۔فوج کے سپاھی پھرے پرھوتے ھیں۔مقبرہ بالکل سادہ ھے، چمکدار سُرخ اور سیاہ پتھروں کا لیکن نہایت بارعب،اندرپہنچ کرچند سیڑھیاں نیچے اترنا پڑتا ھے، آهسته آهسته خاموشی سے ، لینن تقریباً زندہ لیٹا ھوا معلوم ھوتا ھے۔ سر کی طرف سے چل کر بائیں جانب ھوتے ھوئے لینن کو ھر طرف سے دیکھ سکتے ھیں۔ یه جسم کس طرح محفوظ ھے سمجھ میں نہیں آتا۔"[1]

اس یاد داشت کے آخر میں احتشام صاحب کے چار مضامین دونوں ملکوں کی مشترکہ ثقافتی دولت، اُردو ادب کے جدید ترجحانات اور اکتوبر انقلاب، لینن اور اُردو کے دانشور، گورکی اور اُردو ادب، بھی شامل ہیں۔ یہ چاروں مضامین ہند سوویت دوستی کے ترجمان "سوویت دیس" میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کی اپنی ایک اہمیت ہے۔

احتشام صاحب کی یہ کتاب ہر گز ہم تک نہ پہنچتی اگر اسے ڈاکٹر اجمل اجملی اپنی ذاتی کوششوں اور دلچسپیوں سے مرتب کر کے شائع نہ کرتے۔ ڈاکٹر اجمل اجملی نے ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر ریسرچ اسکالروں کے لئے تحقیق کی راہ میں آسانیاں فراہم کر دی ہیں ورنہ ایسی کتابیں گم نامی کی نذر ہو جاتی ہیں اور کئی اچھے اور سچّے فنکار کی واقعی موت

---

[1] سوویت یونین تاثرات اور تجزیے۔ صفحہ ۹۵

ہو جاتی ہے۔

احتشام صاحب کی ان یادداشتوں یا نوٹس کو باقاعدگی سے سفر نامہ نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ سفر نامہ میں جو ترتیب و نظم ہوتا ہے اس میں نہیں ہے اور نہ ہی مکمّل تاثرات ہیں۔ "ساحل اور سمندر" میں بہر حال ایک تخلیقی نثر سفر نامہ کی دلچسپیوں کو دوبالا کرتی ہے کیونکہ احتشام حسین کی تخلیقی نثر میں شگفتگی، شادابی اور دلآویزی کی منفرد آمیزش ہے۔ "سوویت یونین ...... تاثرات اور تجزیئے" میں نثر کا وہ حسن بھی نہیں ملتا تو قاری کو مزید مایوسی ہوتی ہے۔ احتشام صاحب اگر اس کو مکمّل کرتے تو اس کی کیا صورت ہوتی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں پر اس کا ذکر اِس لئے ضروری سمجھا گیا کہ یہ ایک نامکمّل سفر نامہ ہے اور احتشام صاحب کی تخلیقی کاوشوں کے ذکر میں اس کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئیے۔

باب پنجم

مکتوب

انسان کی فکر، محسوسات اور ردّ عمل وغیرہ کے اظہار کے عام طور پر تین واسطے ہیں :

(۱) جسمانی حرکت

(۲) صوت

(۳) نقش

جسمانی حرکت میں مختلف اعضاء کی تحریک کے ذریعہ اپنے محسوسات اور خیال کا اِظہار آدمی ازل سے کرتا آیا ہے مثلاً سر اور گردن کو جنبش دے کر اثبات یا نفی کا اِظہار، انگلیوں سے اعداد و شمار وغیرہ کا اِظہار۔ بازو لہرا کر جوش وغیرہ کا اظہار۔ اسی طرح پلکوں سے، بھوؤں کو سمیٹنے اور پھیلانے سے، دونوں ہاتھ اُٹھانے، مٹھّی بند کرنے، کانوں پر انگلیاں رکھنے وغیرہ بہت ساری جسمانی حرکات ہیں جن کے ذریعہ آدمی مافی الضمیر کی ادائیگی کرتا آرہا ہے۔ حرکات نے بڑھ کر رقص و موسیقی جیسے فنون کو بھی پیدا کیا۔

صوت نے نہ صرف آدمی بلکہ دوسرے ذی روح کو بھی

معنی خیز بنانا شروع کیا اور مختلف ضرورتوں کے تحت مختلف قسم کی آوازیں پیدا کرنی شروع کیں جن کے مظاہرے آج بھی عام ہیں۔ اسی صوت نے بتدریج سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ناموں کو جنم دیا اور الفاظ پیدا ہوئے لیکن یہ دونوں اظہار اس وقت کام کے تھے اور ان کی ترسیل ممکن ہے۔ جب آدمی کسی دوسرے آدمی کے روبرو ہو۔ سامنے نہ ہونے کی شکل میں پہلے کچھ نقش بنائے گئے مثلاً کسی سے کوئی جانور طلب کرنا ہو تو اس کا مخصوص جانور کا کسی طرح نقشہ بنادیا گیا۔

نقوش کو بامعنی بنانے کے لئے آدمی نے دو سمتوں میں سفر کیا۔ ایک تصویری اظہار دوسرا حروف کی ایجاد۔ تصویری سمتوں میں سفر نے زمین پر نشانات، پتھروں کو تراش کر مطلوبہ شکل میں واضح کرنا اور پھر نشانات کو ہو بہو تصویروں میں ڈھالنا گویا نقش اُجاگر کرنے کے عمل میں تعمیر، مصوری اور تحریر تین کار آمد فنون آدمی نے دریافت کئے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ تحریر کی ایک قسم مکتوب نگاری دراصل ما فی الضمیر کے اِظہار کا وہ نقش ہے جسے آدمی ارادی طورپہ دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ موجودگی میں جو کام صوت سے لیا جاسکتا ہے عدم موجودگی میں وہی کام تحریر سے لیا جانے لگا اور مکتوب نگاری کا اس طرح آغاز ہوا۔

آدمی ہر لمحہ ترقی کرتا رہا ہے۔ قدرت نے مٹی بنائی تو اس نے اس مٹی سے پیالہ بنالیا، آگ دیکھی تو اس نے اس سے چراغ بنایا، اسی طرح فنون لطیفہ ہو، سائنس ہو یا تہذیب و تمدن، ہر میدان میں گویا بیل گاڑی سے خلائی راکٹ تک کی ترقی آدمی کے ہاتھ آئی۔ تحریر نے مکتوب نگاری سے ترقی کر کے فکشن کے دلکش نمونوں کو جنم دیا۔ پھر یہی نہیں قدیم فن کو بھی جدید ترین بنانے میں آدمی نے ہر ممکن کوششیں کیں لہٰذا مکتوب نگاری جو مافی الضمیر کے تحریری اظہار کی قدیم ترین شکل ہے اس نے ترقی کر کے تخلیقی فنکاروں کے یہاں خود بھی تخلیقی مرتبہ حاصل کرلیا۔

اُردو میں جو سب سے پہلا مکتوب نگار ہے وہ ہمارے محققین کی رسائی سے ہنوز دور ہے ہماری تحقیق اب تک اس کا تعین نہیں کر سکی ہے کہ اُردو کا پہلا مکتوب نگار کون تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ایک عرصے تک اہلِ علم حضرات نے اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا، لوگ اُردو میں خط لکھنے کو اپنے مرتبہ اور شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ غالبؔ پہلے شخص تھے جنھوں نے اُردو میں خطوط نگاری کو وقار بخشا اور مکتوب نگاری کو محض اظہار و خیر وعافیت کے بجائے ایک فن بنادیا۔

خطوط کئی لحاظ سے بڑے اہم ہوتے ہیں۔ یہ مستند نمائندہ اور پیغام رسانی کا موئثر ذریعہ ہوتے ہیں۔ فکر، محسوسات، جذبات، فیصلہ، ردعمل اور راز وغیرہ کے اظہار کا موئثر واسطہ ہوتے ہیں۔ دوئم خطوط میں ان جذبات کی آنچ بھی محسوس کی جاسکتی ہے جو

بظاہر اظہار میں نہیں آتے۔ان کے علاوہ خطوط ذاتی، نجی، کاروباری رسمی اور ادبی غرضیکہ مختلف مواد کی ترسیل کا آسان ذریعہ ہوتے ہیں۔خطوط کی اہمیت اور اس کے مقام کے سلسلہ میں مختلف لوگوں نے اپنے ذہن رسا سے کام لیتے ہوئے مختلف انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔ایک انگریز مصنّف نے لکھاہے:۔

"A MAN' S SOUL LIES NAKED IN HIS LETTERS." '1

غلام رسول مہر فرماتے ہیں : ۲

" خطوط اور مکاتیب ہر شخص کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لئے نہایت عمدہ اور بڑی حد تک قابلِ اعتماد سرمایہ ہیں۔"

مکتوب نگار نے جو کچھ بھی تحریر کیا ہے ضروری نہیں ہے کہ اسے ادب میں جگہ دی جائے کیونکہ سماج میں ادب کا حلقہ کچھ جدا ہے ایک عام اور مختلف المزاج نوعیت کے حامل خط کو ادب میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔اسی خیال کا اظہار مشہور ناقد ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"خطوط نگاری خود ادب نہیں۔مگر جب اس کو خاص ماحول ،خاص مزاج ،خاص استعداد اورخاص آن ،خاص گھڑی اور خاص ساعت میسر آجائے تو یہ ادب بن سکتی ہے۔مگر خط کو ادب بنانے کا کام بہت مشکل ہے۔

---

۱ بحوالہ تنقیدی مطالعے ۔ڈاکٹر شارب ردولوی

۲ بحوالہ تنقیدی مطالعے ۔ڈاکٹر شارب ردولوی

آئینہ گری ہے شیشہ گری . . . اور آئینہ ساز بہت کم ہے لوگ ایسے ہوں گے جو صحیح معنی میں ایسا
آئینہ ڈھال سکتے ہوں گے جس کے جلوے خود تقاضائے نگاہ بن
جائیں گے اور بھر نظّارہ اپنے جوہر کی ہر ادبی
لکیر کو مشر گاں بنادیں گے۔“ [1]

خطوط کسی شخص کی ذاتی زندگی کا عکاس ہوتے ہیں مگر وہ انفرادی ہو کر بھی اجتماعی حالات کو پیش کرتے ہیں۔اس میں غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں بھی شامل ہوتا ہے اوراس کے اندر بہت نئی معلومات پوشیدہ ہوتی ہیں۔اسی خیال کا اظہار ڈاکٹر شارب ردولوی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

”خطوط نجی اور شخصی ہونے کے باوجود اجتماعی اورآفاقی حیثیت رکھتے ھیں۔اس لئے کہ ان کے ذریعہ علمی اورفنّی معلومات کے علاوہ بہت سی ایسی معلومات فراھم ھوجاتی ھیں جن سے مطالعۂ ادب میں مدد ملتی ھے اور شخصی مطالعہ میں تو نہ جانے کتنی نئی باتوں کااضافہ ھوتا ھے۔“ [2]

انسانی زندگی میں خطوط کی بڑی اہمیت ہے۔عام زندگی میں اس سے جہاں خیریت کا آنا جانا ہوتا ہے وہیں کاروباری باتیں بھی طے پاتی ہیں۔اس سماجی رشتے ناتوں سے بھری زندگی میں کسی کی خیریت نہیں معلوم ہونے پر ہم کس قدر بے چین ہو جاتے ہیں۔؟خوشی اور غم کے خاص مواقع پر اظہار کی ترسیل کے لئے تو خطوط کلیدی رول ادا کرتے

---

[1] بحوالہ تنقیدی مطالعے ۔ڈاکٹر شارب ردولوی

[2] بحوالہ تنقیدی مطالعے ۔ڈاکٹر شارب ردولوی

ہیں۔یوں تو ٹیلیفون کی ایجاد نے سماجی، کاروباری اور ذاتی خطوط کی توسیع کو ضرور متاثر کیاہے پھر بھی ٹیلی فون خط کا بدل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ادباء و شعراء نے فن کے نکات کی بحثیں بھی خطوط میں کی ہیں اور نرم و گذار کیفیات کا اظہار بھی ان کے خطوط میں ملتا ہے۔

مکتوب نگاری نے ادبی تقاضوں کو کئی لحاظ سے پورا کیا ہے۔اس نے ادیب کے نہاں خانوں تک رسائی حاصل کرنے میں معاونت کی ہے۔ خطوط کی نفسیاتی کیفیات کی روشنی میں اصل جذبات تک پہنچنے میں واقعی مدد ملتی ہے۔ نظریہ اور فکر کے علاوہ خطوط نے نثر کی ترقی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔اردو ادب میں متعدد ایسے فنکار سامنے آئے جنہیں قومی ادیب یا شاعر کی حیثیت حاصل ہے اور جن کے مکاتیب کے مجموعے شائع ہوئے تو ان کی ذاتی زندگی اور شخصیت کے مخفی پہلو اُبھر کر واضح شکل میں سامنے آئے۔ غالبؔ نے مکتوب نگاری کے ذریعہ مراسلہ کو مکالمہ بنادیا۔ان کے خطوط میں مخاطب کے ساتھ جو بے ساختہ ، بے تکلف اور تصنّع سے پاک رویّے پائے جاتے ہیں انہوں نے اردو نثر کو شگفتہ بنانے میں بڑی مدد دی ہے۔ واجد علی شاہ کے خطوط میں بیگمات کے لئے تڑپ اور آرائش بے جا کا اظہار ہے۔ رجب علی بیگ سرور کے خطوط مقفّی اور مرصّع نثر کے نمونے ہیں۔ بقول انور سدید ''سُرور غالبؔ کی طرح قدیم اور جدید کے سنگم پر کھڑے ہیں۔'' [1] سر سیّد اپنے مقصد کے اظہار میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔ مخالفوں کی یورش سے وہ کئی جگہ غم زدہ اور زخم خوردہ

---

[1] اُردو ادب کی مختصر تاریخ ۔۔ڈاکٹر انور سدید صفحہ ۳۰۶

نظر آتے ہیں۔ اُن کی نثر سادہ مگر بیانیہ اظہار کا عمدہ نمونہ ہے۔ شبلی کے خطوط عطیہ فیضی کے نام حسن و جمال اور ذاتی احساسات کے اچھے نمونے ہیں۔ شبلی کے خطوط کے مطالعہ کے بعد ان کی شخصیت اُن کی ذہنی کشمکش کے آئینہ میں کچھ اور واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ مُفتی صدرالدین آزردہ کے خطوط میں ایک صابر و شاکر انسان کی جھلک ملتی ہے جو ایک خاص تہذیب کا نمائندہ ہے۔ نذیر احمد نے خشک مضامین کی بحث میں بھی ادبی شان پیدا کر دی ہے وقار الملک کے خطوط میں دوستوں سے شکوہ اور احباب کی کج روی کا ذکر ہے۔ وقار الملک ہر لمحے فکرِ قوم میں غلطیاں و پیچاں نظر آتے ہیں اور مخالفین سے مقابلہ کے لئے کمر بستہ دکھائی دیتے ہیں۔ محسن الملک اپنے مکتوبات میں بے نیاز، بے ریا اور صاف گو نظر آتے ہیں۔ محمد حُسین آزاد کے مکتوب کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ یہ وہی آزاد ہیں جن کی انشاء پردازی کی دھوم رہی تھی۔ ان کے خطوط میں قطعیت، سادگی اور ایجاز کے عناصر نمایاں ہیں۔ اکبر حُسین اکبر الہٰ آبادی اپنے خطوط میں اپنے مضطرب اور بے چین جذبات کی تصویریں اُبھارتے ہیں۔ ان خطوط میں جذبے کی سچائی اور خلوص ضرور ہے لیکن ان میں غالب یا شبلی کے اسلوب کی تازگی اور نُدرت نہیں ہے۔

اقبال کے خطوط کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی مفکّر، سماج، ملّت اور ادب کے اسرار و موز کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ درد مند دِل کے ساتھ فکر میں غلطاں و پیچاں نظر آتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے مزاح اور شائستہ طنز کو اپنے مکتوب

میں جگہ دی۔ مولانا محمد علی جوہر کے مکاتیب ان کی آپ بیتی اور ان کی ذاتی زندگی کے مختلف کوائف کو پیش کرتے ہیں۔ ابو الکلام آزاد کے مکاتیب کو لوگ انشائیہ گردانتے ہیں پھر بھی ان کے یہاں الفاظ کی بلند آہنگی، اشعار کے بر محل استعمال اور نثر کا وقار و طنطنہ پایا جاتا ہے اور بقول انور سدید:-

" ابوالکلام نے پلوٹا رك اور سینیکا کے انداز میں موضوعات کو چھیڑا اور ایك مخصوص نشاطیه کیفیت پیدا کی ھے۔ " [1]

اسی دور میں محمد علی ردولوی کی بے ساختہ اور شگفتہ نثر پڑھنے کو ملتی ہے۔ جن کے خطوط کے مطالعے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جانی پہچانی فضا میں کوئی شخص بے تکلفی، سادگی اور خلوص سے گفتگو کر رہا ہو۔

مذکورہ بالا مشاہیر کے خطوط کے مختصر مطالعہ کے بعد جب ہم احتشام حسین کے خطوط کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوتی ہے جو قریبی عزیز بن کر ہمارے دُکھ درد میں شریک ہے اور خوشیوں میں بھی ہمارے پاس بیٹھا تبسّم لُٹا رہا ہے۔

---

[1] اُردو ادب کی مختصر تاریخ۔۔ صفحہ ۳۹۴

احتشام حُسین کی شخصیت اپنے عہد کی مقبول ترین شخصیتوں میں سے ایک تھی۔ وہ رواداری، منکسر المزاجی، وضع داری، محبت و شرافت کے پیکر تھے۔ وہ عالم بھی تھے، ادیب بھی اور شاعر بھی۔ اپنے عہد کے بیشتر ادیبوں اور شاعروں سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ نوجوان ادیبوں اور طالب علموں اور شاعروں کی وہ بڑی ہمّت افزائی کیا کرتے تھے اور نوجوان ادباء بھی ان سے ملاقاتیں کرنا، مختلف مسائل پر ان سے گفتگو کرنا یا خط لکھنا اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔ احتشام صاحب کا مزاج تھا کہ وہ ہر خط کا جواب دیتے تھے خواہ وہ کسی بڑے ادیب، شاعر، محقق، نقّاد نے انہیں لکھا ہو یا کسی نئے طالب علم نے۔ لوگ کبھی ان سے اپنی کتاب پر مقدمہ یا تبصرہ لکھنے کی فرمائش کرتے یا کسی مسئلے کے سلسلے میں کچھ دریافت کرتے یا اپنے تحقیقی موضوع پر ان سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتے۔ احتشام صاحب سبھی کو ان کے مرتبے کے مطابق جواب دیتے اور ہر مسئلہ پر بہت سمجھا کر بڑے اطمینان سے خط لکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مکتوب الیہم کی فہرست بہت طویل ہے اور اگر سب کے نام لکھنے کی کوشش کی جائے تو گنتی سینکڑوں سے ہزاروں تک پہنچ سکتی ہے۔ ان کے عہد کا کوئی اہم نام ایسا نہیں ملے گا جس کے نام ان کے خطوط نہ ہوں۔ مثلاً قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی ادیبؔ، اثرؔ لکھنوی، سجّاد ظہیر، فیض احمد فیضؔ، احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی، علی سردار جعفری، آل احمد سُرور، جمیل جالبی، شان الحق حقّی، جوش ملیح آبادی، رشید احمد صدیقی، خواجہ غلام السیّدین، فراقؔ گورکھپوری، محی الدین قادری زورؔ، وقار عظیم، وزیر آغا، ڈاکٹر محمد حسن،

عبادت بریلوی، علی رضا، خواجہ احمد فاروقی، کیفی اعظمی، غلام ربانی تاباں، جگن ناتھ آزاد، شارب ردولوی، شمیم حنفی، قمر رئیس، عقیل رضوی، مظہر امام، محمود الحسن، خلیق انجم، جعفر عباس، شمیم نکہت، جعفر رضا، سلام مچھلی شہری، کلام حیدری، عبدالقوی دسنوی، ڈاکٹر محمد مثنّیٰ وغیرہ۔ علماء ادباء اور شعراء کے مراسلوں کا جواب وہ پابندی سے دیتے تھے، رشتہ دار گاؤں اور محلّہ کے بزرگ احباب اور عزیزوں سے بھی خط کے ذریعہ دور رہ کر بھی رابطہ قائم رکھتے تھے۔

احتشام صاحب کے خطوط کا اسلوب سادہ، سلیس اور دوٹوک ہے۔ مافی الضمیر کی ادائیگی واضح طور پر ہوتی ہے وہ عام طور پر خط میں خیریت دریافت کرنے اور اپنی خیریت لکھنے کو ثانوی درجہ دیتے ہیں اسی لئے فوری توجہ طلب امر سے خط کا آغاز کرتے ہیں۔ خطوط کے الفاظ ہلکے پھلکے اور گھریلو ہوتے ہیں۔ بعض ادبی و علمی مسائل سے لبریز خطوط میں عام استعمال کے الفاظ کی جگہ تحقیق اور تنقید سے متعلق اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے لیکن جب مسئلہ ادبی ہو تو زبان بھی ادبی ہونی چاہئیے ویسے عام طور پر ان کے خطوط انکساری و خاکساری اور بے پناہ محبت کے نمونے ہوتے ہیں۔ بزرگوں کا ادب، احباب کے خلوص اور شاگردوں کی محبت کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کے اکثر خط طویل ملتے ہیں۔ ان کے خطوط میں باتیں تفصیل سے ہوتی ہیں اور مطلوبہ ہر گوشہ پر اُن کی نظر ملتی ہے۔ ایک ایک مسئلے پر بہت ہی غور و خوض کے بعد وضاحت سے جواب دینا ان کی عادت تھی۔ جوش نے احتشام صاحب کے بارے میں کہا ہے کہ وہ کسی بھی مسئلہ کو ناخن سے اُٹھاتے ہیں۔ احتشام صاحب کی نگاہ دُوربیں تھی یعنی بہت گہرا تھا، آرائیں استحکام تھا اور مشورے تبیتی تھے۔ اُن کے احباب اور شاگردان

دور رہ کر بھی اُن سے مشورے کرتے رہتے تھے شاید اپنی وضعداری کو نبھاتے ہوئے بھی اُنہیں بہت سارے خطوط لکھنے پڑتے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے نام لندن سے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"تین دن کے اندر میں نے قریب بیس خط مفصل اور طویل لکھے ہیں۔ اب چند خطوں کے جواب اور باقی رہ گئے ہیں۔" [1]

احتشام صاحب کے اس جُملے سے اُن کی محبت ان کی وضع داری اور ان کی زود نویسی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ احتشام صاحب لندن، امریکہ، کناڈا اور جرمنی میں رہ کر بھی اپنے مخلصین کو یاد کرتے رہے۔ حالانکہ وہ وہاں بے انتہا مصروف و مشغول رہے تھے۔ "ساحل اور سمندر" میں احتشام حُسین نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ انہیں خطوں کا بے چینی سے انتظار رہتا تھا اور خط پڑھ کر اس کا جواب لکھ کر کچھ اطمینان سا ہوتا تھا۔ جس طرح غالب ہرکارے کے منتظر رہتے تھے احتشام صاحب بھی ڈاکیے کی راہ تکتے تھے۔ غالب نے تو مراسلہ میں مکالمہ کا انداز پیدا کیا ابوالکلام آزاد نے مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کی مگر احتشام حُسین التزام سے بے نیاز رہے۔ انہیں اپنے خطوط کو رسائل و اخبارات کی زینت بنانا مقصود نہیں تھا مگر جب ڈاکٹر محمد حسن دریافت کرتے ہیں کہ ان کے خطوط کو شائع کرادیا جائے تو اس کے متعلق احتشام حُسین لکھتے ہیں:۔

" خطوط اگر اس قابل ہوں کہ شائع ہوجائیں تو ضرور نقوش کو بھیج دیجئے، مجھے کوئی اعتراض نہیں، اس آفاق کی کارگھہ شیشہ گری

---

[1] فروغ اردو لکھنؤ احتشام حُسین نمبر صفحہ ۵۳۶

میں رہنا ہے ورنہ یہ کہتا کہ ان میں سے کچھ
بھی کم نہ کیجئے:" [1]

درج بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ احتشام صاحب نے وہ سارے خطوط کسی خاص مقصد کے لئے نہیں لکھے تھے اور نہ ان کی اشاعت ان کے ذہن میں تھی بلکہ اپنی دنیا میں مگن وہ اپنے رفقاء اور عزیزوں کو خط لکھتے رہے۔ اس اقتباس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام صاحب چاہتے تھے کہ ان میں سے بعض باتیں حذف کردی جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں کوئی ایسی نجی بات ہو یا معاصرین کے بارے میں کوئی ایسی بات لکھی ہو جس کو وہ نہ چاہتے ہوں کہ منظر عام پر آئے یا کسی کو ان کی تحریر سے تکلیف پہنچے۔

احتشام صاحب جب بھی کسی نئے ادیب یا نئی کتاب کا مطالعہ کرتے اور انہیں کوئی قابل ذکر بات نظر آتی تو فوراً صاحب مضمون سے رابطہ قائم کرتے، اسے اس کی محنت پر مبارک باد دیتے اور کوئی کمی پاتے تو وضاحت چاہتے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کو پہلی مرتبہ خط لکھتے ہوئے وہ یوں رقمطراز ہیں :-

" یہ خط شاید ایک اجنبی کا نہ ہو کیونکہ
آپ نے کم سے کم میری تحریریں پڑھی ہیں۔
آپ کے ایک آدھ مضامین دیکھے تھے لیکن ادیب
علی گڑھ میں خود اپنے متعلق آپ کا مقالہ دیکھ
کر بے حد مسرّت ہوئی اور آپ سے بہت سی

---

[1] فروغ اردو لکھنؤ احتشام حسین نمبر صفی ۵۳۸

امید یں وابستہ ہوئیں۔ مجھے نہ جانے کیوں یہ خیال تھا کہ آپ علی گڑہ میں ہیں ۔ انہیں دنوں کبیراحمد جائسی لکھنؤ آگئے۔ میری استدعا پر انھوں نے آپ کا پتہ بھیج دیا۔

بہت سے اختلافات کے باوجود (جن کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں) مجھے آپ کا مضمون بے حد پسند آیا اور جی چاہا کہ آپ کے بارے میں کچھ اور جانوں ۔ یہ خط اسی سلسلہ میں ہے۔ میں نے آپ کے مضمون کا ذکر اپنی کتاب "تنقید اورعملی تنقید" کے نئے اڈیشن میں دیباچے میں کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔" [1]

احتشام صاحب نوجوانوں کی حوصلہ افزائی اور قدر شناسی میں بہت فیاض تھے۔ نوجوانوں اور نئے لکھنے والوں کی تحریروں کو بھی باقاعدہ پڑھتے تھے، ساتھ ہی ان سبھوں سے رابطہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کے مطابق:-

"مشاہیر ناقدین میں نئی نسل کے ساتھ سب سے قریبی اور براہ راست رابطہ احتشام صاحب ہی کا تھا" [2]

---

[1] ماہنامہ "آہنگ" گیا احتشام حسین نمبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۶۶-۶۵

[2] ماہنامہ "آہنگ" گیا احتشام حسین نمبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۶۶

اسی طرح احتشام حسین سلامؔ مچھلی شہری کے نام پہلا خط اس طرح لکھتے ہیں :-

" مجھ سے ملنے کی خواهش شاید اس لئے هوگی که آپ هر اس نوجوان میں جسے علم وادب کے نئے رجحانات سے دلچسپی هے کوئی ذوق مشترك پاتے هوں گے اور ممکن هے آپ مجھے بھی ایسا هی سمجھتے هوں ،ویسے تو آپ سے تعارف نهیں لیکن آپ کی نظمیں نیا ادب' اضطراب ،ادبی دنیا وغیرہ میں دیکھتا رهتا هوں اور ایك ادبیات سے دلچسپی لینے والے کی حیثیت سے به غائر نظر دیکھتا هوں ۔

آپ کی مختصر تحریر میں جو اضطراب هے اس نے مجھے قهقهه لگانے پر نهیں بلکه سوچنے پر مجبور کیا ۔مجھے سوشلزم سے دلچسپی ضرورهے لیکن یه نهیں جانتا که سوشلسٹ مفکر هوں بھی یانهیں بهر حال سوشلزم هی کو صحیح راسته جانتا هوں ۔" [1]

درج بالا خط سے جہاں احتشام صاحب کی نوجوانوں سے محبت ان کے احترام اور ان کی رہ نمائی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے عزیزوں اور شاگردوں کی

---

[1] ماہنامہ "آہنگ" گیا احتشام حسین نمبر صفحہ ۷۸

ذہنی پرورش کرتے تھے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اپنے شاگرد ڈاکٹر محمد حسن کو لکھتے ہیں:-

"انگریزی مضامین کے متعلق میں آکر باتیں کروں گا لیکن اس درمیان میں آپ ذرا امریکی پبلک کے نقطہء نظر سے معلوماتی مضامین لکھ ڈالیئے۔ افسانوں کے ترجمے اجازت لے کر کر ڈالئے، مجھے لکھئے کہ کوئی مضمون یا افسانہ بھیجنے کے لئے تیّار ہے یانہیں تو میں پتہ لکھوں اور خط بھی لکھ دوں، آؤں گا تو اس سلسلے میں زیادہ تعمیری اور مفید باتیں ہوں گی۔" [1]

وہ اپنے شاگردوں کے ذاتی معاملات میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ وہ کیا لکھ رہے ہیں؟ اگر نہیں لکھ رہے ہیں تو کیوں نہیں لکھ رہے ہیں:-

"روسی اسکالر شپ تو خیر، فرانسیسی کے لئے ضرور کوشش کرنا چاہیے تھا۔ رُوس کے لئے سُنا ہے حسینی صاحب کاانتخاب ہوگیا ہے۔ بھر حال باخبر رہنا چاہیے اور جیسے ہی پھر موقع ملے اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جو آپ کے دل کی "نامحکمی" ہے اس کاعلاج یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ دنوں کے لئے اس ماحول

---

[1] فروغِ اُردو احتشام حسین نمبر صفحہ ۵۳۶

سے باہر نکلنے کا موقع ملے ،دوسرا علاج وہی ہے جس کا میں کئی بار ذکر کر چکا ہوں یعنی شادی کا جوا......جو یہاں ذو معنی ہے۔"[1]

احتشام صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے شاگردوں کے مضامین پڑھ کر ان کی ہمت افزائی کرتے تھے انہیں ان کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے تھے اور خوبیوں کی تعریف کرتے تھے۔ محمد حسن صاحب کے نام ایک خط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کی تحریروں سے کس قدر دلچسپی لیتے تھے:-

"انشاء والا مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے ایک نئے انداز میں ان کا مطالعہ کیا۔ایک بات البتہ کھٹکی ۔عام طور سے آپ کے یہاں REPETITION نہیں ہوتا ۔اس مضمون میں ایک آدھ مقامات پر نظر پڑا ۔دوسری بات یہ کہ داستانی عنصر پر ضرورت سے زیادہ زور ہو گیا۔ایک بات اور کہ انشاء کی فارسی غزلیں دیکھنے کی ضرورت ہے جو اس درباری ماحول جدّت برائے جّدت اور مسابقت میں مشکل زمینوں پر چلنے سے پاک ہیں۔ مضمون بڑھائیے تو انشاء کی ہندوستانیت پراور زیادہ

---

[1] فروغِ اُردو احتشام حسین نمبر صفحہ ۵۳۸

لکھئیے ۔ویسے مجھے لکھنے کا ڈھنگ پسند آیا
اوروھی تازگی ملی جو آپ کے اکثر مضامین میں
ملتی ھے اورجس پر مجھے رشک آتاھے ۔

پرسوں عبادت کی کتاب "غزل اوردرس
غزل" آئی ۔عبادت بے حد محنتی ،مخلص اور
حوصلہ مند، ادیب ھیں ۔لیکن ان کی دو
خامیوں کی طرف انھیں کسی نہ کسی شکل میں
بارھامتوجہ کرچکاھوں ۔اس کتاب میں بھی
ھے۔بات کو پھیلانااور اتناپھیلانا کہ طبیعت عاجز
آجائے ۔دوسرے بنیادیعنی فکری عُنصر کاکمزور
ھونا ۔پھر مجھے خوشی ھے کہ یہ کتاب شائع
ھو گئی ۔ ضرور دیکھئے گا۔" [1]

احتشام صاحب خطوط کے ذریعہ اپنے شاگردوں اور عزیزوں کی رہنمائی برابر کرتے رہے۔ وہ لوگ جوان کے براہ راست شاگرد نہیں تھے انہیں بھی وہ مشورے دیتے، اُن کی ہمّت افزائی کرتے۔ان کے خطوط سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی وہ ابوذر عثمانی کو پی ایچ۔ ڈی کا موضوع بتارہے ہیں تو ڈاکٹر محمد حسن کو ڈی لٹ کے متعلق رائے دے رہے ہیں۔ چیلی شیف (ماسکو) اور اسمایلو اعینل (ازبکی لڑکی) کے لئے کتابوں کی فہرست بھیج رہے ہیں تو قاسم صدیقی اور ڈاکٹر شارب ردولوی

---

[1] فروغ اُردو احتشام حسین نمبر صفحہ ۵۳۹

کے ادبی سوالات کے جواب دے رہے ہیں۔ محمد میاں (جعفر عباس) کے لئے اردو زبان کی ابتداء اور آغاز کے متعلق کتابوں کے نام بھیج رہے ہیں تو ڈاکٹر عبد الجلیل کے مضامین کی اصلاح کر رہے ہیں۔ ان میں بھی احتشام صاحب کا طریقہ ہمدردانہ اور ہمّت افزائی کا ہوتا تھا۔ وہ بہت بڑے ناقد بن کر سامنے نہیں کھڑے ہو جاتے تھے کہ سوال کرنے یا رہنمائی حاصل کرنے والے کی شخصیت ہی چھُپ جائے۔ وہ ہمیشہ اسے اپنے برابر کا درجہ دیتے اور اس کو کام کرنے کا بڑھاوا دیتے اس کی تعریف کرتے اور اسی میں اس کی تصحیح بھی ہو جاتی۔ ڈاکٹر عبد الجلیل کے نام ان کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ کیجئے:-

"میں نے آپ کا مضمون لفظ بہ لفظ اور غور سے پڑھ لیا ۔جگہ جگہ اس پر قلم بھی چلایا ہے۔یہ مضمون نہ صرف معلوماتی اور سائنٹفک ہے بلکہ دل چسپ اور نیا بھی ہے ۔میں آپ کے دلائل سے بالکل متفق ہوں۔ یقیناً غالبؔ کی زندگی میں خاصا تناؤ تھا اور ان کی تکلیفیں جسمانی نہ تھیں ۔آپ نے ذہنی تکلیف اور قبض وغیرہ کے جس تعلق کا ذکر کیا ہے اور ذیابطیس کی جن پیچیدگیوں پرنظر ڈالی ہے وہ بہت فیصلہ کن اور مُدلّل ہیں۔بعض انگریزی الفاظ کا بھی اگر ترجمہ ہو جائے تو اچھّا ہے ورنہ بریکٹ میں ان کی ذرا سی تشریح کر دی جائے۔ سوانح حیات اور بیماریوں کی تاریخی ترتیب اس

معلومات کے مطابق ہے جو ہمیں اس وقت حاصل ہے ۔مجھے واقعی اس مضمون کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ۔ کبھی کبھی ایسی چیزوں کے لئے وقت نکالئے ۔"[1]

احتشام صاحب خواہ کتنے ہی مصروف ہوں یا خرابی صحت کا شکار ہوں وہ کبھی بھی علم و ادب اور شاگردوں کے مسائل حل کرنے سے بے تعلق نہیں ہوئے ۔ڈاکٹر شمیم حنفی نے جب اپنے تحقیقی مقالے کے لئے خاکہ ترتیب دینے کی گذارش کی اس وقت احتشام صاحب سفر میں تھے۔اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود انہوں نے خاکہ لکھ کر ڈاکٹر شمیم حنفی کو بھیج دیا۔احتشام صاحب نے اسے چند سطری خاکہ قرار دیا جبکہ ڈاکٹر شمیم حنفی کے مطابق :-

"وہ فُل اسکیپ تین صفحات پر پھیلاہوا تھا اور اس عالم میں لکھا گیا تھا کہ احتشام صاحب سفر میں تھے طبیعت ٹھیك نہیں تھی اور مصروف تھے ۔" [2]

احتشام صاحب اپنے بزرگوں، عزیزوں اور قریب ترین افراد سے بھی نجی پریشانیوں یا ذاتی مشکلات کا ذکر نہیں کرتے تھے مگر جب خط لکھتے تو اکثر اپنے ساتھ گذرے ہوئے حادثے کا ذکر کرتے اپنی بیماری، خرابی صحت، اُداسی اور افسردگی کا بیان بھی کرتے اور ساتھ ہی ذہنی کوفت اور اُلجھنوں کو بھی خط میں جگہ دیتے تھے۔اپنے عزیزوں کی

---

[1] دبنش و بینش، کوثر چاندپوری صفحہ ۹۵

[2] نیادور، لکھنؤ احتشام حسین نمبر صفحہ ۱۷ "یاداس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ"

علالت پر خطوں کے ذریعہ ہمدردی کا اظہار کرنے اور مشورے بھی دیتے رہتے۔ احتشام صاحب نہایت حسّاس دل کے مالک تھے اسی لئے جب کسی کے انتقال یا بیماری یا حادثے کی خبر انہیں ملتی تو فوراً خط لکھتے اور اپنی تمام تر ہمدردی کا اظہار کرتے، تسلّی دیتے، ہمت بندھاتے، حوصلے سے کام لینے کو کہتے۔ دوسرے کے غم میں برابر کے شریک ہوتے۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کی شریک حیات کے انتقال پر احتشام صاحب اُنہیں لکھتے ہیں:-

"محترمہ بھابھی صاحبہ کے اچانک انتقال کی خبر ملی اور کمال صدمہ ہوا ۔زندگی اور موت کے کھیل میں زندگی ایک بازی پھر ہار گئی اورآپ ایک حیثیت سے بالکل تنہا رہ گئے ۔یوں تو بھرے پُرے گھر میں ایک ہی فرد کی کمی ہوئی ہے لیکن ایک ایسی فرد کی جس کی حیثیت آپ سے بھی زیادہ مرکزی تھی ۔یہ بات غم میں اور اضافہ کرتی ہے ۔احساسات یہی ہیں لیکن عقل کہتی ہے کہ صبر کی تلقین کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کہنا چاہئیے ،موت حیات بشری کالازمی جُز ہے اور بے بسی صبر کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں دکھاتی۔ یہ انسان کامقدّر ہے! خدا سے دعا ہے کہ آپ کو اور سارے عزیزوں کو صبر جمیل عطا کرے اور مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ دے ۔" [1]

---

[1] فروغ اردو احتشام حسین نمبر صفحہ ۵۴۷

میں نے لکھا ہے ''احتشام حسین کے خطوط عام طور پر انکساری و خاکساری اور بے پناہ محبّت کے نمونے ہوتے ہیں'' بزرگوں کا ادب، احباب کے خلوص اور شاگردوں کی محبّت کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے'' لیکن ادبی مباحث میں جب ان کے نقطۂ نظر پر حملہ ہوتا ہے تو ضبط کا دامن ان کے ہاتھ سے بھی چھوٹتا سا دکھائی دیتا ہے۔ اختر علی تلہری سے (عالمگیر، لاہور) اور عمیق حنفی سے (شب خون، الہ آباد) جو ادبی بحثیں ہوئیں ان میں احتشام صاحب کا جمال جلال میں تبدیلی ہوتا نظر آتا ہے۔ عمیق حنفی نے لکھا ہے:

''جدید شاعری ہی آج شاعری ہے۔ باقی سب تقلید، نقّالی، بھٹائی، ڈھنڈورچی پن، اشتہاربازی، منافقت، مجاوری، مصلحت کوشی اور دنیاداری ہے، بازی گری اور شعبدہ بازی ہے، غیر ادبی مقصد کے حصول کی بیساکھی ہے۔'' [1]

جواب میں احتشام صاحب فرماتے ہیں:

''یہ خط پڑھ کر مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوا ہے کہ جدید شاعری خود ایک پیر تسمہ پا بن کر قاری پر سوار ہونے کی فکر میں لگا ہوا ہے اور اسے ریگزاروں میں بھٹکائے رکھنا چاہتا ہے جہاں نہ نخلستان ہے نہ ٹھنڈے پانی کے چشمے۔ وہ تو ابھی سے گویا

---

[1] شب خون الہ آباد ۱۳/ اگست ۱۹۶۶ء

اس منزل پر پہنچ چکاھے کہ اپنی شاعری کے سوا سارے ادبی سرمائے کو تقلید ،نقّالی،بھٹّائی (بھٹئی)ڈھنڈورچی پن ،اشتہار بازی ،منافقت، مجاوری، مصلحت کوشی ،دنیاداری،بازی گری، شبعدہ بازی اور غیر ادبی مقاصد کے حصول کی بیساکھی قرار دیتا ھے ۔یہ دعوٰی اسوقت ھے جب ابھی پوت کے پاؤں پالنے میں ھیں ،آگے کیاھو گا اس کا تصّور بھی نھیں کیا جاسکتا۔ایسے دعوے اور ایسے حملے ھر شخص کر سکتا ھے اور کر لیتا ھے ۔اس کی کسوٹی وہ عمل ھو گا جو ثبوت میں پیش کیا جائے ۔ایسے دعووں سے کھوکھلے پن کی بُو آتی ھے اور عام زبان میں اسے خود فریبی بھی کھتے ھیں ۔" [1]

اس اقتباس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام صاحب کبھی کبھی تحریری توازن کی سرحد سے پرے ہٹ جاتے ہیں اور جن الفاظ کو بحث میں دوسرا شخص استعمال کرتا ہے ان ہی الفاظ سے وہ کام لے لیتے ہیں۔ احتشام صاحب نہایت ہی نرم دل انسان تھے اُن سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ اتنے سخت الفاظ میں جواب دیں گے مگر ان پر ادر ترقی پسند

---

[1] ماہنامہ شب خون الہ آباد ۱۹۶۶ء

تحریک پر حملے ہوئے تو وہ بیقرار ہو جاتے ہیں۔اس سے بات بڑھ جاتی ہے اور عمیق حنفی آگ اگلنے لگتے ہیں :-

''وہ لوگ جو بیسویں صدی میں رہ کر کسی اور صدی میں سوچتے اور محسوس کرتے ہیں،میرے لئے انتہائی مضحک ہیں ۔میں اور تمام جدید شاعر رفتگاں کے فکر و فن کے قائل ہیں اور اپنے قدیم ادبی سرمائے کا احترام بھی کرتے ہیں لیکن آج کے قدامت پرستوں اور رفتگاں کے نقالوں اور بے مغز مُقلّدوں کو اس عِزّت و اِحترام کا مُستحق نہیں سمجھتے۔ کیا احتشام صاحب کو یہ نٹ،بھانڈ،نقّال،مسخرے، خلاق یا فنکار نظر آتے ہیں۔اگر نہیں تو پھر خفگی کیوں؟ معافی چاہتا ہوں کہ اُن اُگلے ہوئے نوالے چبانے والوں کے لئے اور زیادہ سخت اور شدید الفاظ استعمال نہیں کر سکا۔''[1]

اس خط سے احتشام صاحب کے صبر کا پیمانہ چھلک نہیں پڑتا۔وہ خود پر قابو پانے کی پوری کوشش کرتے ہیں:-

''ویسے تو میں ماہناموں میں ایسی ادبی بحثوں کو نامناسب اور غیر مفید سمجھتا ہوں جو صرف دو شخصوں کے لئے مناقشہ کی

---

[1] ماہنامہ شب خون الہ آباد ۱۹۶۶ء (اکتوبر) ص ۵۶

شکل اختیار کر لیں اور اصول سے ہٹ کر
ذاتیات تک پہنچ جائیں ۔لیکن اپنی طرف سے
ختم کرنے کے لئے چند سطریں لکھتا ہوں۔
گفتگو سنجیدہ، علمی اور مدلل ہو تو بحث
گوارا بھی ہو سکتی ہے ،لیکن افسوس ہے کہ
ایسا نہیں ہے۔" [1]

احتشام صاحب کے خطوط کے مطالعے سے ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔وہ ایک اچھے استاد تو تھے ہی اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ تصنّع اور ریاکاری سے بہت دور تھے۔ان کے خطوط میں ان کی شخصیت کھلی ہوئی کتاب کی طرح نظر آتی ہے۔وہ جو کچھ درست سمجھتے تھے اس کے اظہار میں کبھی گریز نہیں کرتے تھے خواہ وہ ہم عصروں کے بارے میں ہو یا شاگردوں اور عزیزوں کے بارے میں۔

ان کے خطوط سے ان کے نقطۂ نظر کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ انہوں نے مختلف جگہوں پر اپنے نظریئے کے بارے میں لکھا ہے لیکن کہیں پر یہ محسوس نہیں ہوتا ہے کہ وہ اپنے نظریئے کو منوانا چاہتے ہیں یا اس کی تبلیغ کر رہے ہیں۔کسی چیز کی اچھائی یا برائی خوبی یا خامی کے بارے میں ان کا ایک نظریہ ہے اور وہ بغیر کسی تکلّف کے پیش کر دیتے ہیں۔

احتشام صاحب اپنے عہد کی بے حد محبوب شخصیت تھے۔ان کے شاگردوں، مداحوں اور ہم عصر ادیبوں کی بہت طویل فہرست ہے

---

[1] ماہنامہ شب خون الہ آباد ۱۹۶۶ء

جن سے مختلف موضوعات پر ان سے خط و کتابت ہوتی تھی اسی لئے
احتشام صاحب کے خطوط ان کے نقطۂ نظر اور ان کی شخصیت کو سمجھنے
کا بہت اچھا وسیلہ ہیں۔

ان کے بیشتر خطوط ابھی شائع نہیں ہوئے ہیں
ضرورت ہے کہ انہیں جمع کر کے ضروری حواشی کے ساتھ شائع
کیا جائے تاکہ احتشام صاحب کی شخصیت کے نئے گوشوں پر روشنی
پڑ سکے۔

احتشام صاحب کے خطوط میں ذاتی زندگی کے نشیب و فراز
کے ساتھ ان کے عہد کی ادبی اور علمی، سیاسی اور تہذیبی تحریکات اور
رجحانات کی بھی جھلکیاں ملتی ہیں جو ان کے خطوط کی تاریخی اور ادبی
اہمیت میں اضافہ کرتی ہیں۔

اختتامیہ

یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہی کہ ہمارے صفِ اوّل کے فنکار ادب کی مختلف اصناف میں نمایاں کارگذاری کی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود بس کسی ایک ہی میدان کے مرد کہے جاتے ہیں اور پھر بتدریج ان کی بقیہ صلاحیتوں پر اس طرح وقت کی گرد پڑتی چلی جاتی ہے کہ آنے والی نسلیں بس اتنا جاننا کافی سمجھنے لگتی ہیں کہ اردو میں باقاعدہ تنقید حالی سے شروع ہوتی ہے، آزاد نے "آبِ حیات" لکھی ہے، شبلی تاریخی مواد جمع کرتے ہیں اور مولوی عبدالحق نے کوئی بڑا کام کیا ہوگا اس لئے اُنہیں بابائے اُردو کہا جاتا ہے...... ؟ اور آگے بڑھئے تو

نیاز فتح پوری صرف ایڈیٹر، فراق گورکھپوری صرف شاعر، آل احمد سُرور، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، اختر اورینوی اور کلیم الدین احمد صرف نقاد......!

بلاشبہ زمانہ اختصاص (SPECIALIZATION) کا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں کو خانوں میں تقسیم کرکے مہارت حاصل کی جارہی ہے تاکہ بہتر سے بہتر نتائج سامنے آئیں۔ اس رویہ اور رجحان کا اثر فنون لطیفہ پر بھی پڑا ہے اور یہاں بھی اختصاص کا بازار گرم ہے حالانکہ فن بنیادی مرحلہ میں سخت ریاض کا متقاضی ہے اور یہ ریاض ہر چہار سمت میں ہوتا ہے تاکہ متوقع تعمیر پسند کے مطابق کی جاسکے۔ ادب میں اس کی شدید ضرورت ہے کیونکہ ادب کی سرحدیں کائنات کی سرحدیں ہیں بلکہ غالب تو تمنا کے دوسرے قدم کی تلاش میں اور آگے جانا چاہتے ہیں اور اقبال ستاروں سے آگے کے جہانوں تک عشق کے حوصلوں کا امتحان چاہتے ہیں ایسی صورتحال میں اگر کوئی صرف فن ناول سے سروکار رکھے اور بڑا ناول نگار کہاجائے اور کوئی صرف جدید افسانوں کا مطالعہ کرے اور افسانے لکھ کر دورِ جدید کے بڑے افسانہ نگاروں میں شمار کیا جائے تو کیا ایسے افراد کو ماہرین ادب بھی کہا جاسکتا ہے؟ تنقید کی دنیا تو اور وسیع ہے۔ نقّاد کے سامنے مجموعی طور پر ادب کی مختلف اصناف سے اس کی گہری واقفیت ہونی چاہیئے۔ یہ واقفیت نظریہ اور عمل، تجربہ اور مشاہدہ اور اسلوب ہر میدان میں ہونی چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ماضی اور عہد حاضر کے منفرد نمونے بھی اس کے سامنے ہوں نیز عالمی ادب کے معیاری نمونوں اور مزاج پر بھی اس کی نظر

ہونی چاہئیے تب ہی وہ ایسے فیصلوں تک پہنچ پاتا ہے جو اس کی تنقید کو معیار اور وقار دونوں عطا کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہمارے بزرگ فنکاروں کی تعلیم وتربیت کے دوران اگر انہیں ادب پڑھایا جاتا تھا تو صَرف نحو بھی مروجہ زبانیں عربی اور فارسی وغیرہ بھی اور اس کے ادب سے بھی، واقفیت کرائی جاتی تھی پھر فقہ، حدیث، طب، منطق، نجوم وغیرہ مختلف رائج علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ نتیجہ میں نہ تو ان کی فکر محدویت کا شکار ہوتی تھی نہ تجربہ۔ اسی لئے محدود وسائل کے باوجود ماضی کے فنکاروں نے جو نقوش بنائے ہیں وہ آج بھی رشک کی نگاہوں سے دیکھے جارہے ہیں۔

پروفیسر احتشام حُسین بھی اب ہمارے ماضی کا ایک حصہّ ہیں۔ ان کی شخصیت کی تعمیر جن خطوط پر ہوئی ہے وہ ہمیں بنیادی ریاض کے حامل نظرِ آتے ہیں اور ماضی کے خطوط کی یاد دلاتے ہیں ہم اُن خطوط کا مطالعہ اس لئے بھی پیش کررہے ہیں کہ ادب میں بھی اختصاص (SPECIALIZATION) کی جو عام ہوا چل پڑی ہے اور اس سے بڑی شخصیتوں کے سامنے آنے میں جو کمی ہوتی جارہی ہے اس کا احساس دلایا جاسکے۔ احتشام حُسین اگر صرف تنقیدی مضامین لکھتے تو ان کی شخصیت اوران کی تنقید نگاری کو وہ بلندی اور وہ وقار حاصل نہ ہوتا جو آج ہے۔ اُن کے تخلیقی ذہن اور تخلیقی عمل کے تجربات نے انہیں دوسرے فن پاروں کی تہہ تک اُترنے میں مدد دی ہے۔ اُن کے سفرناموں کے مطالعہ سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ فکر و نظر کی تعمیر میں اُن کے سفر

امریکہ اور یورپ نیز روس نے کس قدر مدد پہنچائی ہے اُن کے افسانوں کے ذریعہ ہم اُن کی ہمدردیوں اور اُن کے کرب دونوں کے نقوش تک پہنچ سکتے ہیں۔ اُن کی شاعری محسوسات کی دنیا کو کس طرح سمیٹتی ہے۔ اور ان کے احساسات کی زبان کس طرح ہم سے مخاطب ہوتی ہے پھر وہ جب کسی سے تحریری گفتگو کرتے ہیں یعنی خط لکھتے ہیں تو ان کا سلوک کیا ہوتا ہے اور کس طرح وہ اپنے محسوسات اپنی فکر اور نقطہء نظر کی وضاحت کرتے ہیں اور کیا مجموعی طور پر یہ سارے جلوے اُن کی شخصیت کو عظیم بنانے میں معاون ہوتے ہیں یا نہیں؟

کہتے ہیں نقاد جب تک تخلیقی صلاحیتوں سے لیس نہیں ہوتا اس کی تنقید معیار کی بلندیوں تک نہیں پہنچتی۔ شاید اسی لئے اُردو میں تنقیدی مضامین کے مجموعے ''حوالہ جات'' سے بھرے ملتے ہیں۔ مگر خود نقاد کہاں ہے اسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ لیکن احتشام حسین کے یہاں مذکورہ کمی کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ وہ تخلیق کی راہوں کے بھی مسافر ہیں۔ احتشام حُسین کے افسانوں میں اُن کا دھڑکتا ہوا دل اور ناانصافیوں کے نتیجہ میں پیدا کرب واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ امن پسند اور آزاد سماج کے تصوّر کے وہ خطوط ہیں جن پر روشن مستقبل کی بنیادیں رکھی جاسکتی ہیں۔ احتشام حُسین کی شاعری ''تنہائی کے لمحات میں گایا ہوا وہ گیت ہے جو حوصلوں کو جِلا بخشتا ہے۔'' جو اخلاص تجربہ دیتا ہے اور آرزوؤں اور تمناؤں کے نقوش کے ساتھ ساتھ فکر رسا اور

وسیع النظری کے خطوط نمایاں کرتا ہے۔ یہ عناصر نقد کی ماہئیت اور مزاج کی تہوں تک رسائی میں بے حد معاون ہوتے ہیں۔ احتشام حُسین کو امریکہ اور یورپ کے مختلف ممالک کے ساتھ روس کے کئی علاقوں کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ سفر مطالعہ کو وسیع، نظر کو کشادہ اور تجربہ کو پختگی عطا کرتا ہے۔ احتشام حُسین نے جن دنوں سیاحت کی وہ نہ صرف نظریاتی بلکہ اہم سیاسی انقلابات اور ان کے نتیجہ میں تشکیل نو کا عہد تھا۔ احتشام حُسین پانچویں دہائی کے بالکل اوائل میں امریکہ اور یورپ کے سفر پر گئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے زخم ابھی ٹھیک سے بھرے نہیں تھے، ایشیا اور یورپ کے کئی ممالک کی سسکیاں ابھی ہواؤں میں گونج رہی تھیں مگر بیشتر یورپی ممالک اور امریکی صرف مارکسزم کے بڑھتے قدموں کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور دفاعی نقطہ نظر سے کمزور قوموں اور ذہین افراد کو مختلف ذرائع استعمال کر کے حمایتی بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ احتشام حُسین بھی ایسی ہی ایک دعوت پر سفر امریکہ اور یورپ پر روانہ ہوئے۔ اُن کی آنکھیں امریکہ ویورپ کی ترقی دیکھ کر خیرہ ضرور ہوتی ہیں۔ حسرتوں اور آرزوؤں کی تکمیل میں آسانیاں بکھری دیکھ کر ممکن ہے وہ کشمکش میں پڑ گئے ہوں لیکن اُن کی شخصیت کی تعمیر جن خطوط پر ہوئی تھی اُس میں ''کوما'' تو لگ سکتا تھا ''ڈیش'' نہیں۔ اسی لئے مقابلتاً ان کی استدلالی قوتوں میں اضافہ ہوا اور ان کی سوشلزم پسندی کو مزید تقویت پہنچی۔ سفر روس چھٹی دہائی کے اواخر میں ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ انقلاب چین

کو بھی ایک دہائی سے اوپر کا عرصہ گزر چکا تھا۔ روس تو ان کے خوابوں کی سرزمین تھی لیکن یہ افسوس کا مقام ہے کہ اُس سرزمین کے سلسلہ میں اُن کے محض نوٹس ہمارے سامنے ہیں۔ تاثرات کے وہ اُتار چڑھاؤ جو سفر ناموں میں بین السطور کا کام دیتے ہیں اُن کی بے وقت موت نے صفحہء قرطاس پر اُبھرنے نہ دیا۔ بہر حال جو باقاعدہ سفر نامہ موجود ہے وہ احتشام حسین کے مشاہدہ کی گہرائی، مطالعہ کی وسعت اور تجربہ کی پختگی کا غماز ہے۔ احتشام حسین کے خطوط اُن کے عہد کے سینکڑوں لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ یہ خطوط مختلف مزاج کے مواد سے لبریز ہیں۔ بیشتر خطوط میں افہام و تفہیم کا جو دلکش اور پُر مغز انداز ہے وہ بلا شبہ دعوتِ نظر دیتا ہے۔ علم و ادب کے کینوس پر جو خطوط اُبھرے ہیں وہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ بن گئے ہیں۔

اس طرح احتشام حسین کے افسانوں میں اُن کا دھڑکتا دِل اور ناانصافیوں کو دیکھ کر پیدا کرب، ان کی شاعری میں حوصلہ مندی، اخلاصِ تجربہ، آرزوؤں اور تمناؤں کے نقوش، فکرِ رسا اور وسیع النظری، ان کے سفر نامے میں کشادہ نظری، تجربہ میں پختگی اور استدلالی قوتوں میں اِضافہ اور ان کے خطوط میں افہام و تفہیم کا دل کش اور پُرمغز انداز اور مجموعی طور پر ان سب کی پیش کش میں مہارت احتشام حسین کی تنقید کو رفعت بخشتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی عظیم شخصیت کی تعمیر میں تخلیق و تنقید شانہ سے شانہ ملا کر کام کرتی ہیں لہٰذا محض ان کی تنقیدی نگارشات کے مطالعہ سے احتشام حسین کی

شخصیت مکمل طور پر ابھر کر ہمارے سامنے نہیں آتی بلکہ اس کے لئے ان کی تخلیقی کاوشوں کی حرارت بھی ہمارے پیش نظر رہنا ناگزیر ہے۔

کتابیات

۱. احتشام حسین۔ حیات شخصیت اور کارنامے
ڈاکٹر فداء المصطفٰے فدوی ناگپور بار اوّل ۱۹۸۵ء

۲. اُردو ادب کی مختصر تاریخ — ڈاکٹر انور سدید
مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد بار اوّل ۱۹۹۱ء

۳. اُردو سفر نامہ۔ اُنیسویں صدی میں —ڈاکٹر قدسیہ قریشی
مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی ۲۵

۴. اُردو مختصر افسانہ: فنّی و تکنیکی مطالعہ — ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان
ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

۵. اعتبار نظر — احتشام حسین

۶. بہار میں اُردو افسانہ نگاری مرتبہ: ڈاکٹر وہاب اشرفی
بہار اُردو اکیڈمی، پٹنہ ۴

۷. ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ — ڈاکٹر صادق

۸. تنقیدی مطالعے — ڈاکٹر شارب ردولوی
نصرت پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۸۴ء

۹. داستان سے افسانے تک — وقار عظیم

۱۰. دانش و بینش —کوثر چاندپوری ۱۹۷۵ء

١١. روایت اور بغاوت — سیّد احتشام حسین

١٢. روشنی کے دریچے — احتشام حسین مرتبہ: جعفر عسکری

احتشام اکیڈمی، الہ آباد

١٣. ساحل اور سمندر ۔ احتشام حسین

نصرت پبلشرز، لکھنؤ بار دوم ۱۹۸۴ء

١٤. سوویت یونین۔ تاثرات اور تجزیے — احتشام حسین مرتبہ ڈاکٹر اجمل اجملی

نویگ پریس، دہلی ۱۹۸۴ء

١٥. عکس اور آئینے — احتشام حسین

١٦. ویرانے — احتشام حسین

ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد ۱۹۴۴ء

رسائل

١. ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی مارچ ۱۹۸۳ء

٢. ماہنامہ "آہنگ" گیا جولائی تا نومبر ۱۹۷۳ء احتشام حسین نمبر

٣. ماہنامہ "شاہ کار" وارانسی نومبر، دسمبر ۱۹۷۳ء احتشام حسین نمبر

٤. ماہنامہ "شب خون" ۱۹۶۶ء

٥. ماہنامہ "فروغ اُردو" لکھنؤ فروری ۱۹۷۴ء احتشام حسین نمبر

٦. ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ مئی، جون ۱۹۷۲ء، اگست ۱۹۷۵ء

شهزاد انجم کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ

غوروفکر

عصر حاضر میں اہم شخصیات، تحریکات اور بدلتے منظر نامے پر

بے لاگ تبصرہ

(زیر طبع)

◆

رابطہ کا پتہ

کارڈ سنٹر، بڑی مسجد، معروف گنج، گیا (بہار)

آزادی کے بعد اردو ناولوں کا تنقیدی جائزہ

اردو فکشن کی تنقید میں ایک اہم اضافہ

شہزاد انجم کی کتاب

اردو ناول کے پچاس سال

(زیر طبع)

کامطالعہ ناگزیر ہے۔

رابطہ کا پتہ

کارڈ سنٹر، بڑی مسجد، معروف گنج ، گیا (بہار)

اردو رپورتاژ نگاری میں ایک سنگ میل

چشم دید

تازہ تحریکات اور رحجانات کا

شہزاد انجم

کے قلم سے جائزہ

بہت جلد منظر عام پر آرہا ہے

رابطہ کا پتہ

کارڈ سنٹر، بڑی مسجد، معروف گنج، گیا (بہار)

اردو تنقید کا بدلتا منظر نامہ

تحریکات، رحجانات اور رویے

اہم ناقدین اور ان کی کاوشوں کا جائزہ

اردو تنقید کی نظریاتی اساس

شہزاد انجم

یہ کتاب بہت جلد زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آرہی ہے۔

رابطہ کا پتہ

کارڈ سنٹر، بڑی مسجد، معروف گنج، گیا (بہار)

مصنف کی دیگر زیر طبع کتابیں

(۱) اردو تنقید کی نظریاتی اساس (تنقید)

(۲) اردو ناول کے پچاس سال (تنقید)

(۳) چشم دید (رپورتاژ)

(۴) غور و فکر (تنقید)

(۵) سوراج واد (ترجمہ) نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی

(۶) مکتی بودھ (ترجمہ) ساہتیہ اکادمی، دہلی

رابطہ کا پتہ

کارڈ سنٹر، بڑی مسجد، معروف گنج، گیا (بہار)

Ehtesham Husain (1912-1972) is well known to all of us as a great literary critic. No one, in my opinion, can be a balanced critic unless, at the same time, he is a creative writer as well. Ehtesham Husain fulfils this delicate criterion. However it is a little known aspect of Ehtesham Husain. I have tried to bringout into full lime light this lesser known aspect about him. My study covers **Ehtesham Husain: the person,** *and* **Ehtesham Husain: the critic** *through an analysis of his short stories, his poetry, his travelogue and his personal letters.*

It is hoped that this pioneer study of Ehtesham Husain as a creative writer will attract the attention of the scholars and the amateurs alike, and will help open the doors for similar studies on other literary critics as well.

Shahzad Anjum

EHTESHAM HUSAIN KI TAKHLIQI NIGARISHAT

EK MUTALA

(Creative writing of Prof. Ehtesham Husain : A study)

Dr. Shahzad Anjum

Deptt. of Urdu
Govt. Post Graduate Girls College
Rampur (U.P.)

March 2000

By the same author
(Books in Press)

1. Urdu Tanqeed Ki Nazaryati Asas (Criticism)
2. Urdu Novel ke Pachas Saal (Criticism)
3. Chashm Deed (Reportage)
4. Ghaur-o-Fikr (Criticism)
5. Swarajwad (Translation) NBT
6. Mukti Bodh (Translation)

Sahitya Academy Delhi.

Author's Address:

Dr. SHAHZAD ANJUM
Deptt. of Urdu
Govt. Post Graduate Girls College
RAMPUR - 244901 (U.P.)
Phone : 0595 - 310404 (R)

اُردو تنقید میں سید احتشام حسین کا نام بیسویں صدی کی آخری نصف صدی کا اہم ترین نام ہے۔ انہیں ترقی پسند نقطۂ نظر اور مارکسی تنقید کے ایک نظریہ ساز کی حیثیت حاصل ہے لیکن انہوں نے ادب کو صرف طبقاتی کشمکش اور ذرائع پیداوار سے وابستہ نہیں کیا بلکہ جمالیاتی قدروں، سماجی حالات، نفسیاتی اور تاریخی عناصر کے ساتھ ادب کا مطالعہ کرکے ایک سائنٹفک نظریے کی بنیاد ڈالی یہی سبب ہے کہ آج بدلے ہوئے حالات میں بھی ان کے نظریات ادب کی تفہیم اور ادبی اقدار کے تعین میں رہنمائی کرتے ہیں۔

احتشام صاحب کی ایک حیثیت نقاد کے علاوہ تخلیقی فنکار کی ہے۔ ایک اچھا ناقد وہی ہوتا ہے جو تخلیقی فنکار بھی ہو اس لیے کہ جب تک وہ تخلیقی عمل کے رموز سے آشنا نہ ہو ادب کی صحیح پرکھ کیوں کر کرسکتا ہے؟ احتشام صاحب افسانہ نگار بھی تھے اور شاعر بھی لیکن ان کی شخصیت کے اس پہلو پر نقاد احتشام حسین کی شخصیت ہمیشہ حاوی رہی۔ مجھے خوشی ہے کہ شہزاد انجم نے احتشام صاحب کے تخلیقی کارناموں کا جائزہ لے کر ان کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی۔ شہزاد انجم ادب کے ایک سنجیدہ قاری ہیں۔ ان کی یہ ادبی کاوش ان کے علمی ذوق، خلوص، محنت اور تنقیدی شعور کی نشاندہی کرتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کا یہ ادبی سفر جاری رہے گا اور ان کی تحریریں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

شارب ردولوی

پروفیسر سنٹر آف انڈین لینگویجز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی